وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا

اسلامی روحانی سائنس

مشاہدہ حق

اِس کتاب میں اسلامی روحانی سائنس کے ذریعے حق تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کا آسان ترین طریقہ بتایا گیا ہے

تالیف

مولانا الحاج (کپتان) واحد بخش سیال چشتی صابری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحن اقرب الیہ من حبل الورید و فی انفسکم افلا تبصرون

لب بہ بند و چشم بند و گوش بند
گر نہ بینی ذاتِ حق بر من بخند

مشاہدہ حق

تالیف

مولانا الحاج

کپتان واحد بخش سیال

چشتی صابری

الفیصل ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

جون 1995ء

محمد فیصل نے

تعریف پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر شائع کی

قیمت 05/ روپے

اِنتساب

ہر اُس مردِ مومن

کے نام

جو

اللہ تعالےٰ

کی طلب میں ہے
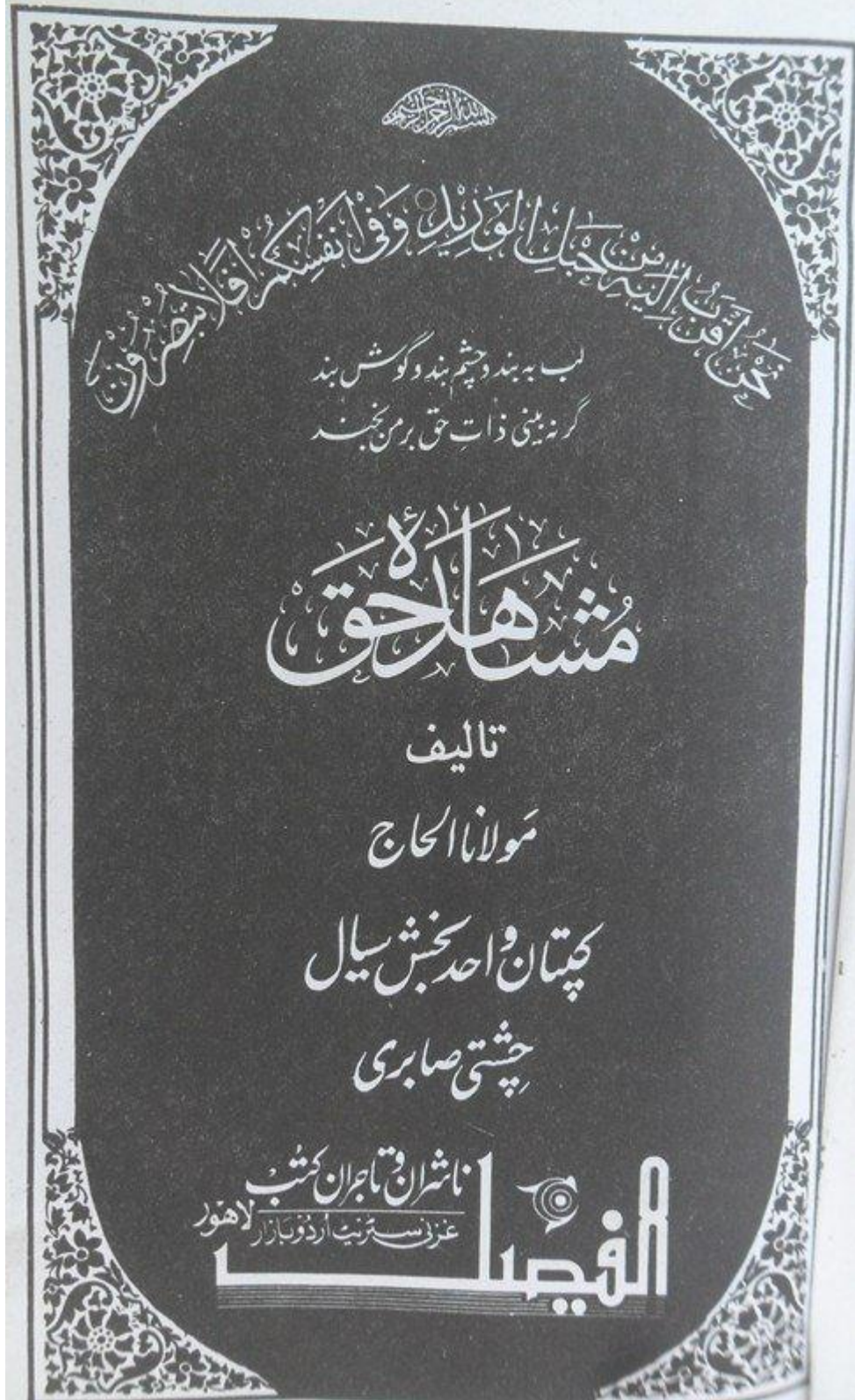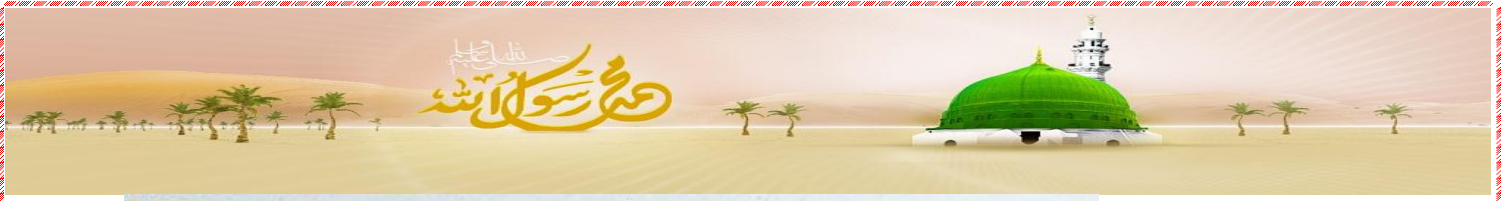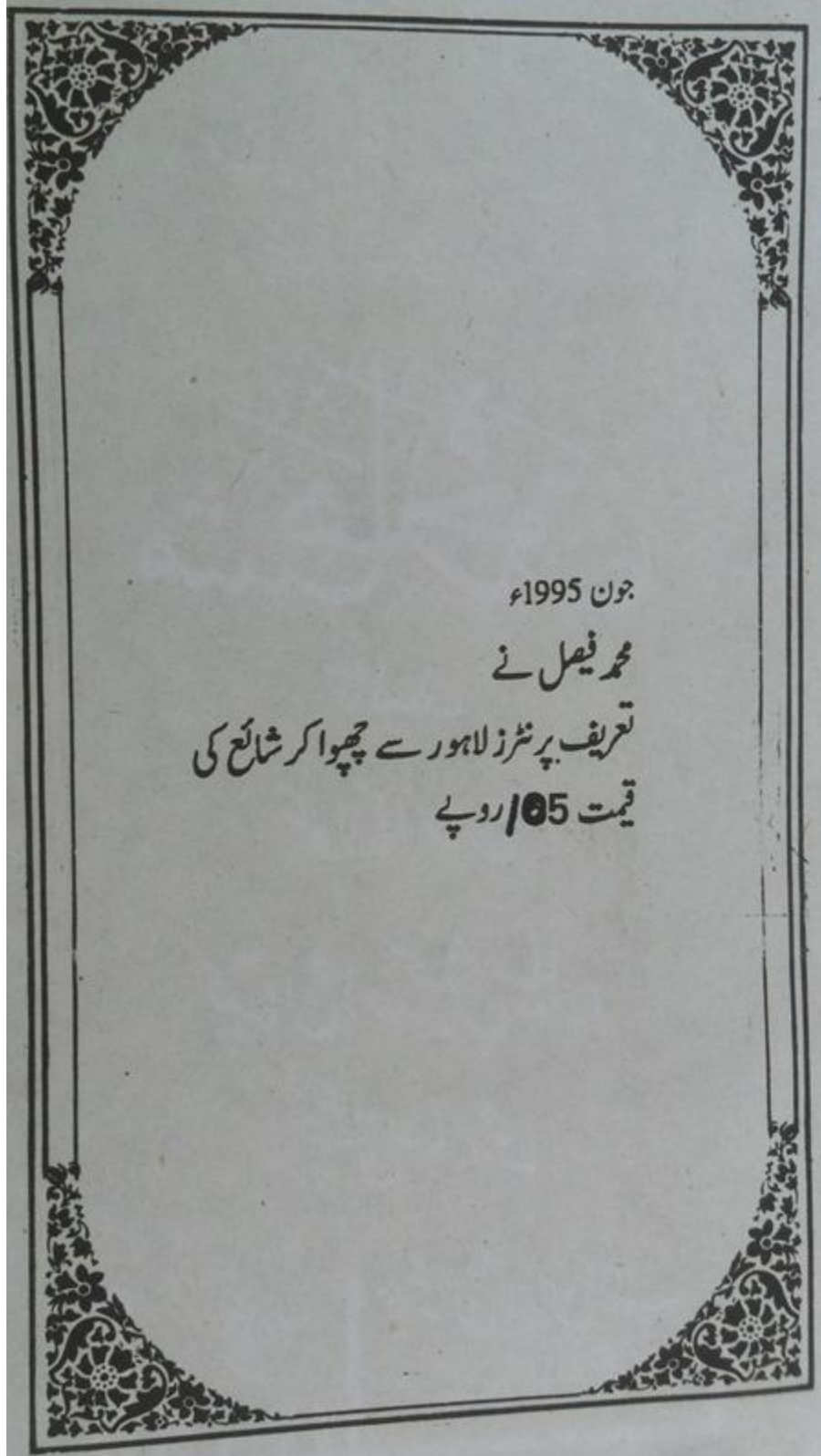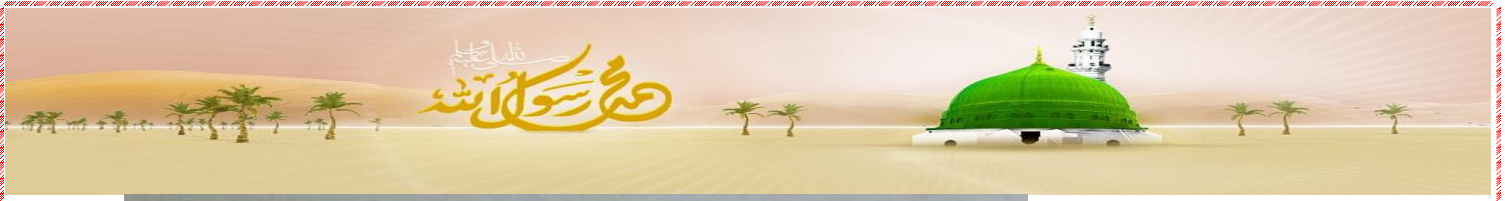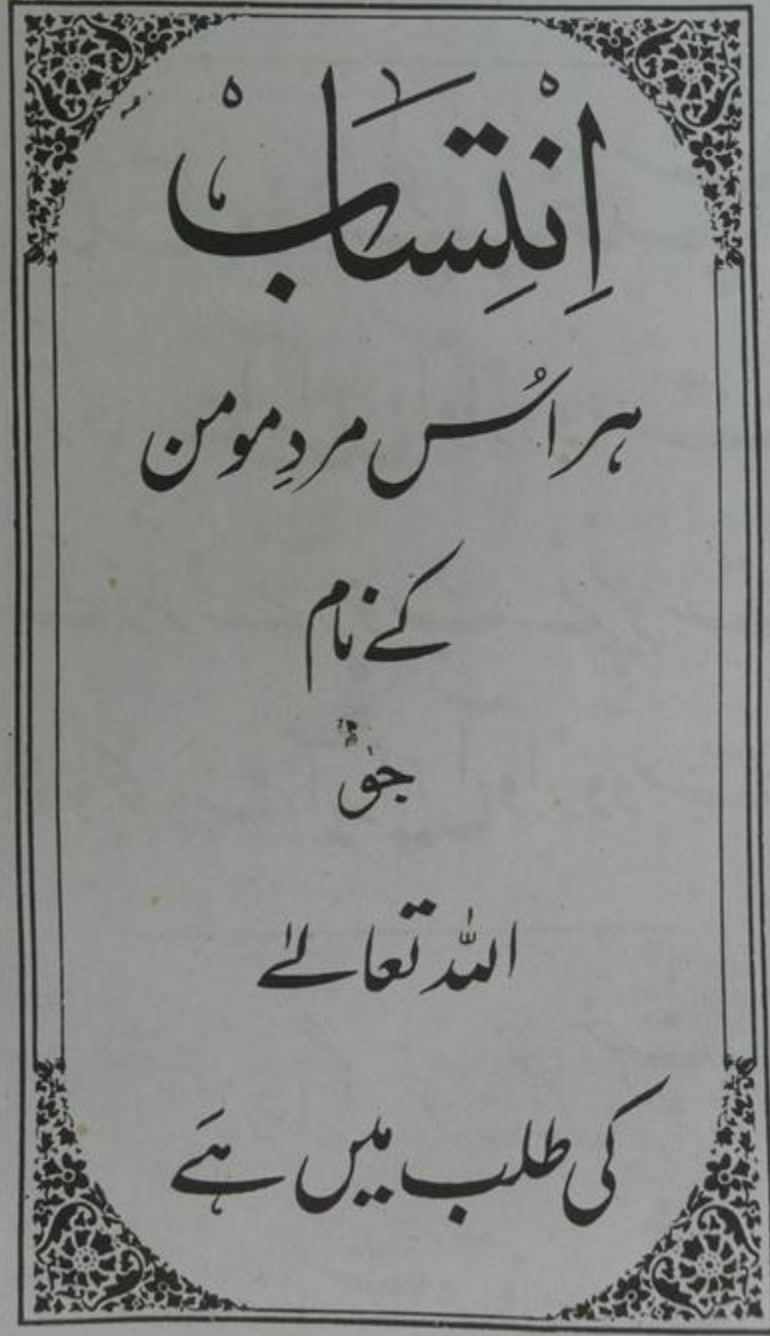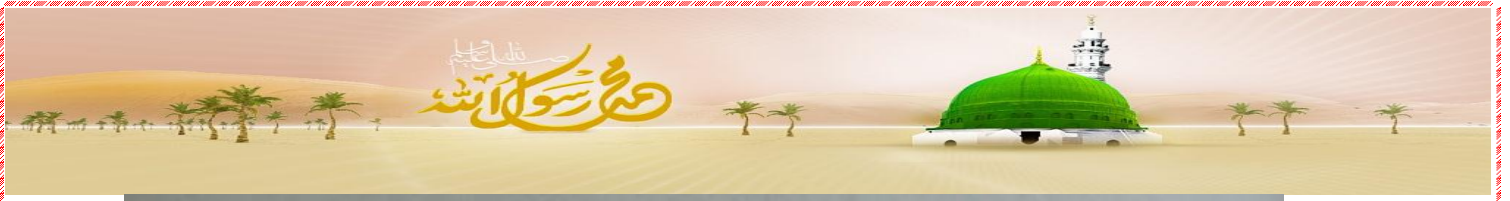
اَلعَبدُ عَبدٌ وَاِن تَعَرَّجَ - وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِن تَنَزَّلَ

عبد عبد ہے خواہ جتنی ترقی کرے، رب رب ہے خواہ جتنا نزول فرمائے

ابنِ عربی

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست

از کجا مے آید ایں آوازِ دوست

نے ز تار و نے ز چوب و نے ز پوست

خود بخود مے آید ایں آوازِ دوست

رومی

آتشِ رخسارِ گل خرمنِ بلبل بسوخت

چہرۂ خندانِ شمع آفتِ پروانہ شد

فہرست مضامین

عشق آساں نبود سوزِ مدام است اینجا
امتحانِ دلِ پختہ و خام است ایں جا
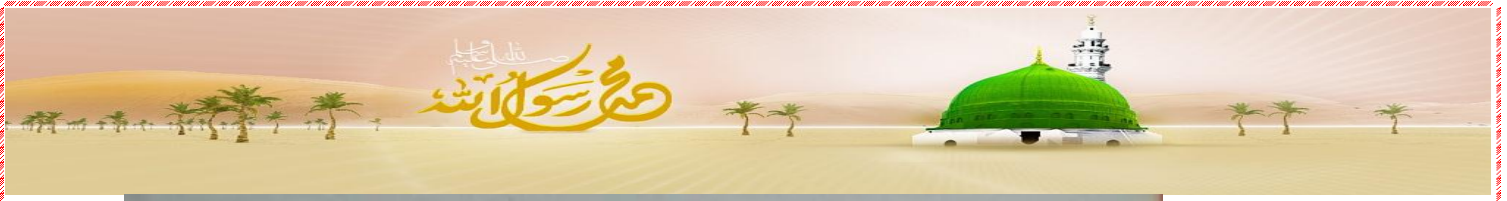
انتخاب از مثنوی مولانا رومؒ

بادہ از ما مست شد نے ما ازو
قالب از ما ہست شد نے ما ازو

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا
او نشیند در حضورِ اولیاء

یک زمان صُحبتِ با اولیاءؔ
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اولیا را ہست قدرت از الٰہ
تیرِ جستہ باز گرداند زِ راہ

فیضِ حق اندر کمالِ اولیا
نورِ حق اندر جمالِ اولیا

قال را بگذار مردِ حال شو
پیشِ مردِ کاملے پامال شو

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نشد
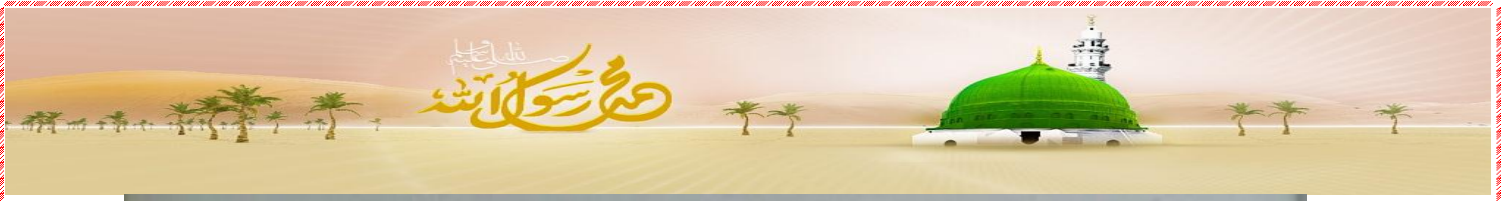
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از شیخ المشائخ حضرت شاہ شہید اللہ فریدی رحمۃ اللہ علیہ

ہمارے زمانے میں دنیا بری طرح ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ تقریباً ہر ماہرِ فن جب اپنے فن کے متعلق کچھ بیان کرتا ہے تو ایک نیا نظریہ پیش کرتا ہے۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہیں۔ ہر شخص اپنی ذات سے ایک ملت بنا ہوا ہے۔ چاہے طبعیات ہوں یا حیاتیات، اقتصادیات ہوں یا سیاسیات۔ اجتماعیات ہوں یا نفسیات یہی افراتفری مچی ہوئی ہے۔ سلمہ اصول متروک ہو گئے۔ اب اصولِ بےاصولی اور علمِ لاعلمی باقی رہ گیا ہے۔ پہلے اخلاقیات کی بنیادوں پر بحث ہوتی تھی اب اخلاقیات کے وجود سے انکار ہونے لگا۔ روحانیت تک شاذ و نادر کسی کی دسترس ہو۔ وہ تو عموماً خارج از بحث ہوتی ہے۔

یہ انتشار فطرتِ انسانی کے برعکس ہے۔ وہ انسان جس کے پاس قلبِ سلیم ہو طبعاً مجمع ہے، منتشر نہیں۔ وہ جامع ہے فارق نہیں۔ جب وہ اپنی علمی جستجو کے دوران متفرق واقعات کے پیچھے ایک عام قاعدہ دریافت کرتا ہے تو اس کو بے انتہا مسرت ہوتی ہے ان عام قاعدوں کے پیچھے ایک اس سے زیادہ عام قانون معلوم کر لیتا ہے تو اس کو اتنا ہی زیادہ قلبی لطف حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ یہ دریافت کرتا ہے کہ سارے قواعد اور قوانین کے پیچھے ایک مطلق قانون اور ایک مطلق قانون ساز کار فرما ہے تو اس کو ایک

خاص قسم کا وجد آتا ہے۔ اسی وجد کو ایمان کہتے ہیں اور جب اور زیادہ غلبہ پالیتا ہے تو عرفان۔ اسی وجد میں وہ اپنی تکمیل پاتا ہے اور اس کو دائمی خوشی اور سرور حاصل ہوتا ہے یعنی انسان فطرتاً موحّد ہے اور توحید یعنی ایک کرنے میں اس کی صلاحتیں ابھرتی ہیں جب اللہ کے رسول علیہ السلام کی توحید کی پکار سنتا ہے تو اس کا قلب اور اس کی روح تسکین پاتی ہے۔ وہ اس لحاظ سے موحّد ہے کہ وہ کائنات کو ایک ہی مطلق ہستی کا مظہر دیکھتا ہے اور اس لحاظ سے بھی موحّد ہے کہ کائنات کے سارے اجزا کو جامع اصولوں کے ڈورے میں پرو دیتا ہے۔ اور اس لحاظ سے موحّد ہے کہ کائنات کی جملہ قوتیں اس کے وجود میں جمع ہیں اور کائنات کی وحدت اسی پر منتہا ہوتی ہے۔ اور وہی اسکا نقطۂ مرکزی ہے۔

برادر محترم واحد بخش سیّال صاحب نے اس مقالے میں بیان کیا ہے کہ انسان کس طرح اپنی فطرت کی تکمیل یعنی توحید حقیقی کو پہنچ سکتا ہے اور اپنی انفرادیت کو وحدت میں کھو کر کیسے دوبارہ پا سکتا ہے۔ یہی راہِ تصوّف ہے جو اسلام کا قلب و روح ہے اور جس کا نمونہ رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ ہے۔ واحد بخش صاحب نے راستے کی منزلیں اس کا آخری مقصود اور وہ نہایت جو ہدایت کی طرف لوٹتا ہے۔ ان سب کا نقشہ کھینچا ہے اور دعوتِ سفر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کرے کہ کوئی اس دعوت کو قبول کر کے سعادتِ ابدی حاصل کرے۔ والسلام والدّعا

جمادی الثانی ۱۳۹۴ھ
کراچی

شہید اللہ فریدی
غَفَرَاللہ ذُنُوبَہٗ وَسَتَرَاللہ عیُوبَہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

مقدّمہ

جو فلسفیوں سے حل نہ ہوا اور نکتہ وروں سے کھل نہ سکا
وہ راز اِک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

اس کتاب کا موضوع اگرچہ دنیا کے تمام موضوعات میں سب سے زیادہ بلند، سب سے زیادہ مشکل اور ادق ہے کیونکہ جہاں باقی تمام موضوعات مخلوق کی حقیقت سے تعلق رکھتے ہیں ہمارا موضوع خود خالقِ کائنات ہے تاہم یہ موضوع سب سے زیادہ دلچسپ اور دلفریب بھی ہے۔ اس وجہ سے کہ انسان کی فطرت میں حق تعالیٰ کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کی ہر چیز کی محبت دراصل حق تعالیٰ کی محبت ہے جو از خود رفتہ موجوں، ہواؤں، لہروں، طوفانوں اور آگ کے شعلوں کی طرح تلاشِ دوست میں ہر جگہ اور ہر طرف سر مار رہی ہے۔ مغربیؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہر سو کہ دویدیم ہمہ روئے تو دیدیم
ہر جا کہ رسیدیم سرِ کوئے تو دیدیم

(جس صنم کی تلاش میں ہم دوڑے وہ تو ہی نکلا اور جس منزل کو ہم نے جالیا وہ تیرا ہی کوچا تھا)

جس دلچسپی سے آج کل اس موضوع یعنی اسلامی روحانیت کو مغربی دنیا دیکھا جارہا ہے اسکی بنا پر دراصل یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی جانی تھی۔ لیکن چونکہ اس زبان میں ہمارے ذوق و شوق، درد و داغ، سوز و گداز اور عشق و محبت کو تھامنے کی وسعت نہیں اس لیے ابتدا اردو ہی سے کی گئی تاکہ آتشِ عشق کے وہ شعلے جو آسمان سے بھی اوپر اٹھا چاہتے

ہیں انگریزی زبان کی ٹھنڈی اور بے جان اصطلاحات کے نیچے دب جانے سے پہلے محفوظ کر لیے جائیں اور قارئین کے لیے ابدی سرمایہ بن سکیں۔

جب اہلِ مغرب نے عیسائیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو حق شناس جانتے تھے کہ یہ بغاوت دراصل تلاشِ حق ہے۔ چنانچہ ایک دو صدیوں کی مادہ پرستی نے دنیا میں جو تباہی مچائی ہے اور بنی نوعِ انسان نے اس کی وجہ سے جتنے مصائب جھیل کر بالآخر روحانیت کا رُخ کیا ہے اس سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عیسائیت کے خلاف یہ بغاوت اسلام کا پیش خیمہ تھی۔ اس وقت مغربی دنیا میں جس قدر اسلامی روحانیت کی مانگ ہے اور ہمارے دیکھتے دیکھتے جتنے یورپ اور امریکہ کے خوش نصیب مرد اور خواتین سنگین حالات کے باوجود بغیر کسی تبلیغی ادارہ کی کوشش کے از خود دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر ہم مسلمانوں نے اسلامی روحانیت کو صحیح طریقے سے پیش کیا تو جارج برنارڈ شا کے قول کے مطابق "اگلی صدی میں ساری دنیا کا مذہب اسلام ہوگا"۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ کتاب اس منزل کی جانب ایک قدم ہے۔

کتاب ہٰذا میں ہستی باری تعالیٰ کے متعلق جو چار قسم کے قرآنی ثبوت بہم پہنچائے گئے ہیں ان میں سے دو کو تو دنیا جانتی ہے اور دو ایسے ہیں جو ان لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کی حقیقت، ذات و صفات اور مکان و لامکان کے متعلق جس قدر پیچ در پیچ اور گمراہ کن نظریات آجکل دنیا میں پائے جاتے ہیں ان سے پیچھا چھڑا کر رسول عربیؐ کا سادہ اور ہر دل میں اُتر جانے والا طرزِ بیان اس کتاب میں اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ بچے بھی سیکھ سکیں، فلاسفر اور منطقی استدلال کے ماہرین بھی مطمئن ہوں اور عقل کی حدِ پرواز سے اوپر جانے والے عشاق بھی مدد حاصل کر سکیں۔ نیز

متعصب غیر مسلم مصنفین کی حرکات سے اور کم فہم مسلم حضرات کی غلط فہمی سے تصوّف یعنی اسلامی روحانیت کے خلاف جتنے غبار کے بادل کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کو بھی ہٹا دیا گیا ہے اور ڈبہ پیروں اور گندم نما جو فروشوں نے تصوّف کے حسین چہرے پر جو بد نما داغ لگا دیئے ان کو بھی دھو دیا گیا ہے۔ جس شربتِ وصل کے لیے دنیا پیاسی ہے وہ سامنے رکھ دی گئی ہے اور مغربی دنیا کی پکار جو پروفیسر آربری کی زبان سے نکلی ہے اُس کا بھی سامان مہیا کر دیا گیا ہے۔ وہ پکار یہ ہے:-

"دو عظیم جنگوں نے دنیا میں جو تباہی مچائی ہوئی ہے اُس سے تنگ آ کر اہلِ مغرب میں سے ہر مرد اور ہر عورت کے دل میں دو آرزوئیں ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں نے تہذیب و تمدن اور روحانیت کے میدان میں کیا ترقی کی ہے۔ دوسری یہ کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے۔ کیا خدا کا وجود ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ کائنات سے اس کا کیا تعلق ہے۔ خاص طور پر انسان کس طرح اُس کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔ ——— بالفاظ دیگر دنیا یہ جاننا چاہتی ہے کہ بڑی بڑی ہستیوں نے ہستی باری تعالیٰ کے متعلق کیا دیکھا ہے اور کیا کہا ہے.... ان حقائق کو معلوم کرنے کے لیے دنیا بھوکی ہے خوراک موجود ہے لیکن ہم سے کہیں دور مقفول پڑی ہے.... اگر حقیقت آشکار ہو جائے تو دنیا کی آنکھیں کھل جائیں گی اور سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا.... خواہ ہم مسلمان ہوں یا غیر مسلم ہم سب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ لہٰذا ہم عیسائیوں کے لیے یہ کوئی خلاف عقل یا خلاف قاعدہ بات نہ ہو گی اگر ہم اسلام کے صوفیاء کے ان حقائق و معارف سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں جن سے ان کی یہ تحریک دنیا کی اتنی بڑی طاقت بن گئی تھی اگر اس کارِ عظیم میں ہمارے مسلمان بھائیوں کا تعاون حاصل ہو سکتا ہے اور علامات سے ظاہر ہے کہ ہو سکتا ہے تو ہم مل کر ان شاندار حقائق کو پھر سے پا سکتے ہیں اور ہم مل کر ایسا مستقبل ڈھونڈ سکتے ہیں کہ جس کی بلند اخلاقی اور روحانی اقدار موجودہ تاریک اور خوفناک دور کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہے۔" ختم ہوا آربری کا بیان۔

مغربی دُنیا کی اس پُکار کو ہم تہِ دل سے لبیک کہتے ہیں اور اس ہدیۂ ناچیز سے ابتدا کرتے ہیں جس کا انگریزی ترجمہ محفلِ ذوقیہ کی طرف سے عنقریب منصّۂ شہود پر آنے والا ہے۔

آخر میں یہ عاجز اُن حضرات کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے اس کتاب کی نشر و اشاعت میں میری معاونت فرمائی ہے خصوصاً یہ احقر روحانیت کے میدان میں مغربی دنیا کے کارواں سالارِ حقیقت کے راز دار طریقت کے شاہباز حضرت شاہ شہید اللہ لینارڈ فریدی مدظلہٗ العالی کا بیحد ممنون ہے کہ حضرت والا مرتبت نے علالت کے باوجود اس عاجز کو تصوف کے ادق مسائل سمجھنے اور عیسائی مذہب کے روحانی پیشواؤں کی محدود روحانی منازل کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں بہت مدد فرمائی ہے. حضرت والا نے کتاب ہٰذا کے لیے جو پیش لفظ رقم فرمایا ہے اس کے لیے احقر خصوصی طور پر ممنون ہے پیش لفظ کیا ہے دونوں جہانوں کی حکمت کا خزانہ اور اسلام کا خلاصہ ہے گویا کوزے میں دریا بھر دیا ہے. یہ عاجز اپنے عزیز جواں سال اور جواں بخت میاں معین الدین اکبر ہاشمی کا بھی تہِ دل سے شکر گزار ہے کہ جنہوں نے کتاب ہٰذا کی طباعت میں بیحد دوڑ دھوپ کی اور ہر قسم کی امداد فرمائی. یہ احقر اپنے چھوٹے بھائی کرنل محمد نواز سیال کا بھی شکر گزار ہے جنہوں نے کتابت کی تصحیح اور دیگر امور میں جانفشانی سے کام لیا. میرے شکریہ کی مستحق میری اہلیہ اور اولاد بھی ہے جنہوں نے کتاب کی تالیف میں ہر قسم کا تعاون کیا. یہ عاجز شیخ عبدالسلام صاحب آئینۂ ادب لاہور اور خوشنویس جناب نبیل احمد خاں کا بھی شکر گزار ہے جنہوں نے کاروباری دلچسپی سے نہیں بلکہ اسلامی جوش و خروش سے اس کارِ خیر میں مدد فرمائی ہے. حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ ان سب حضرات کو دینی دنیاوی، جسمی روحی، ظاہری باطنی نعمتوں سے مالا مال فرمائیں. آمین.

۲۸ جمادی الثانی ۱۳۹۴ھ
۲۰ جولائی ۱۹۷۴ء
لاہور

احقر العباد اَضعَف
واحد بخش سیال چشتی صابری عفی عنہٗ

موجودہ پتہ رابطہ:
ڈاکخانہ اللہ آباد۔ ضلع رحیم یار خان
پاکستان

پہلا باب

بھٹکی دُنیا کو اسلام کی ضرورت ہے

سائنس کی سب سے بڑی غلطی سائنس کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ غیر مادی اور روحانی مسائل METAPHYSICAL PROBLEMS کو مادی ذرائع PHYSICAL MEANS سے حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور بری طرح سے ناکام ہوئی ہے۔ دنیا میں موجودہ بے چینی، بدامنی، انتشار اور جنگ و جدال کی وجہ یہی ہے کہ سائنس نے جہاں کائنات کے ذرّہ ذرّہ کی چھان بین کا ذمہ لے لیا اس نے خالق کائنات کے متعلق اہم ترین سوالات کا جواب تلاش کرنے میں کوتاہی برت رکھی ہے، ساری دنیا یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ کائنات کی اصلیت کیا ہے۔ کس طرح اور کب وجود میں آئی، خالق کائنات کون ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے، وہ کہاں ہے۔ کائنات کا خالق کائنات کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ انسان کی حقیقت کیا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور وہ مقصد کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کا جواب معلوم کرنے کے لئے دنیا تڑپ رہی ہے لیکن کسی وجہ سے سائنسدانوں اور دانشوروں نے ان سوالات کا حل تلاش کرنے کی بجائے راہِ فرار اختیار کر رکھی ہے۔ وہ ان سوالات پر غور کرنے اور جواب تلاش کرنے سے گھبراتے ہیں اور چونکہ ان بنیادی اور اہم ترین سوالات کا جواب تلاش کرنے میں تہذیب مغرب بے بس ہے اس لئے جگہ جگہ پر ٹھوکریں کھا رہی ہے اور بدترین قسم

کی بے چینی، کشیدگی، بدامنی اور افراتفری میں مبتلا ہے۔ مادی اشیاء کی حقیقت معلوم
کرنے سے لاکھوں اور کروڑوں درجہ زیادہ اہم خالق الاشیا کا علم ضروری ہے اور یہ سائنس
کا اہم ترین فریضہ ہے اور اسی اہم ترین فریضہ سے کوتاہی برت کر سائنس نے دنیا میں تباہی
مچادی ہے کیونکہ جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ کائنات کے وجود میں آنے اور انسانی زندگی
کا مقصد کیا ہے ہم کوئی کام نہیں کرسکتے اور ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس لئے
تہذیبِ نو کی سب سے بڑی ناکامی اور غلط کاری یہی ہے کہ خالقِ کائنات کے علم کی بجائے
مخلوق کا علم حاصل کرنے میں مصروف ہے اور منزل کی نشان دہی کئے بغیر رات کے اندھیرے
میں پُرخطر سنسان اور بیابان جنگل کے اندر بغیر راہ، بغیر راہبر، بغیر سنگ میل اور بغیر روشنی
اندھادھند گامزن ہے اور ستم ظریفی یہ کہ نہایت تیزی سے گامزن ہے اور اس بے ڈھنگے سفر
کے انجام کے متعلق آپ خود قیاس فرماسکتے ہیں کہ کیا ہوگا بلکہ انجام آپ کے سامنے ہے۔

تہذیبِ مغرب کی تباہ کاریاں

آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج دنیا میں بدترین قسم کی
خودغرضی، نفس پرستی، عیش پرستی، حرص و ہوس،
بے ایمانی، بے حیائی، بے چینی، کشیدگی اور جنگ و جدل کا دور دَورہ ہے۔ لادینی کا جو
طوفان افقِ مغرب سے اُٹھا ہے اس نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو گھیر لیا ہے اور اب اس
کے تباہ کن اثرات سے کوئی گھر اور کوئی شخص مامون نہیں رہا۔ اس ملحدانہ اور بے لگام
"تہذیب و تمدن" نے تمام مذاہب کی شاندار روایات اور قابلِ قدر اقدار کو تہہ و بالا کر کے
دنیا میں نہایت وحشیانہ اور خودغرضانہ نظام رائج کر دیا ہے۔ اس میں نہیں کہ اقوامِ مغرب
نے سائنس کے میدان میں کچھ ترقی کر کے انسانی زندگی میں چند سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔
لیکن آج کل کے "مہذب" انسان کی درندگی اور وحشی پن نے جو دنیا میں قیامت برپا کر رکھی
ہے اس کے سامنے سائنس کی تمام فتوحات بے معنی اور ہیچ ہیں۔ خدا تعالیٰ کے بنائے
ہوئے قوانین کی بجائے بے راہ اور بے لگام انسان کے بنائے ہوئے خلافِ عقل
IRRATIONAL اور خلافِ فطرت UNNATURAL قوانین پر مسلسل

عمل پیدا ہونے اور حقائق کو مسلسل جھٹلانے کی وجہ سے اِن لوگوں کے دماغ اسقدر مسخ ہو گئے ہیں کہ حق و باطل کی تمیز اِن کے ہاں ختم ہو گئی ہے۔ اس لئے انہوں نے بدی کو نیکی، ناکامی کو کامیابی، ظلم کو عدل، بے ایمانی کو ایمانداری، خود غرضی کو ایثار، تخریب کو تعمیر، بے حیائی کو تہذیب اور عصمت فروشی کو ترقئ نسواں کا نام دے رکھا ہے۔ چونکہ حق و باطل اور خیر و شر میں تمیز کا سرچشمہ خالقِ کائنات کا علم یعنی مذہب ہے مذہب کو خیر باد کہہ کر یہ تمام نام نہاد مہذّب اقوام بدترین قسم کی بے راہ روی اور گمراہی میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ اب اِن کے نزدیک اچھا کام وہ ہے جو ان کی اپنی قوم کے لئے مفید ہو خواہ اس سے دوسری قوموں کی ہزاروں لاکھوں جانوں کا نقصان ہو جائے۔ خون کی ندیاں بہہ جائیں اور بستے ہوئے شادمان شہر اور ملک برباد ہو جائیں۔ ان کو اس سے سرو کار نہیں۔ وہ اپنا اور اپنی قوم کا نفع چاہتے ہیں اور ہر وہ کام یا ہر وہ جرم جس سے ان کا یہ مقصد پورا ہو جائے ان کے نزدیک نیکی ہے۔ قوم NATION اُن کے لئے سب سے بڑا بُت ہے جس کے آستان پر یہ لوگ تمام اصول قربان کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کے ہاں قومی مفاد NATIONAL GOOD کی خاطر بدترین قسم کے جرائم جائز نہیں بلکہ مستحسن ہیں اور ہر قسم کی سیہ کاری، بدکاری، بدمعاشی اور ظلم و ستم روا ہے۔ اپنی تہذیب و تمدّن کے متعلق یہ لوگ کتنے بلند دعوے کرتے رہیں لیکن دراصل یہ لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ جانور تو صرف خورد و نوش پر اکتفا کرتے ہیں لیکن ان لوگوں نے سائنس کی قوت پر قابو پا کر اور انسانی اقدار کو چھوڑ کر دنیا میں اس قدر قیامت برپا کی ہے کہ جس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔ اور کوئی بُرے سے بُرا درندہ بھی اس قدر تباہی نہیں مچا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ عظیم نے ان کو جانور بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہونے کا خطاب عطا کیا ہے

اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلّ (یہ جانور ہیں بلکہ اِس سے بھی بدتر)

سائنس کے اس غلط استعمال کو مولانا رومؒ نے آج سے سات سو برس پہلے یہ فرمایا تھا ؎

علم را بر تن زنی مارے بود　　علم را بر جان زنی یارے بود

(اگر تو علم (سائنس) کو نفسانی خواہشات کے پورا کرنے میں صرف کرے گا تو زہرِ قاتل کا کام دے گا اگر تو اسے روحانی ترقی کے لئے استعمال کرے گا تو یار و مددگار ثابت ہو گا۔)

چنانچہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ سائنس کی ترقی کی وجہ سے ان لوگوں نے جو مہلک سے مہلک ترین آلات ایجاد کئے ہیں سب کمزور اور مظلوم اقوام کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں محض اس لئے کہ ان کی اپنی قوم زیادہ سے زیادہ طاقتور بن سکے اور وہ زیادہ سے زیادہ دولت لوٹ سکیں اور زیادہ سے زیادہ عیش و عشرت کر سکیں۔ اس نیک مقصد کی خاطر بستے ہوئے شہروں کو اجاڑنا، لہلہاتے کھیتوں کو تباہ کرنا، خون کی ندیاں بہانا، لاکھوں کو بے گھر یتیم اور بیوہ بنانا سب جائز ہے۔

مقصدِ کتاب اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ خالقِ کائنات، تخلیقِ کائنات، حقیقتِ انسان اور مقصدِ حیات کے متعلق اُن اہم سوالات کے جوابات بہم پہنچائے جائیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے تاکہ حق تعالیٰ تک رسائی حاصل کر کے اس کے ساتھ تعلق استوار کیا جائے اور اس کے قوانین کو سمجھ کر موجودہ افراتفری اور تباہی و بربادی سے بنی نوعِ انسان کو بچایا جا سکے۔ یہ بہت بڑا کام جس کے لئے ہر طالبِ حقیقت کے تعاون کی ضرورت ہے۔

قوانینِ قدرت کی پابندی کیوں ضروری ہے جب کوئی شخص پہلے پہل کسی ملک میں جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ وہاں کی حکومت سے تعلق پیدا کرتا ہے اور اس کے قوانین سے واقفیت حاصل کرتا ہے تاکہ

ایسا نہ ہو کہ لاعلمی کی بنا پر اُس ملک کے قوانین کی خلاف ورزی کر کے مجرم قرار دیا جائے۔ اسی طرح اس دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس کے بادشاہ سے تعلق پیدا کیا جائے اور اس کے قوانین سے واقفیت حاصل کی جائے تاکہ لاعلمی میں اس سے کوئی غلط کام سرزد نہ ہو جائے وہ سزا کا مستحق بن جائے۔

کیا انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے

قوانینِ قدرت کی پابندی اس لئے ضروری ہے کہ آدمی فطرتاً آزاد پیدا نہیں ہوا بلکہ قوانینِ قدرت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ جو اقوامِ مغرب نے انسان کے لئے ہر قید و بند سے آزاد ہونے کے نعرے لگا رکھے ہیں سب غلط اور بے بنیاد ہیں۔ دنیا میں انسان آزاد نہیں بُری طرح سے مقیّد ہے۔ سب سے پہلے تو وہ طبعی قوانین PHYSICAL LAWS کی قید میں مُقیّد ہے۔ انسان ہرگز اس بات میں آزاد نہیں کہ آگ کے اندر چلا جائے اور دریا میں کود پڑے یا ہوا میں اُڑ جائے۔ وہ اس بات پر بھی قادر نہیں کہ بغیر کھائے پئے رہ سکے۔ وہ اس کام میں بھی آزاد نہیں کہ جس قسم کی غذا چاہے کھا سکے بلکہ وہ صرف وہی غذا کھا سکتا ہے جو انسان کے کے لئے مقرر ہے۔ وہ اس بات میں بھی خود مختار نہیں کہ ٹھوس چیزوں مثلاً پہاڑ دیوار اور زمین کے اندر گھس جائے۔ وہ اس بات پر بھی قادر نہیں کہ سورج کو نکلنے یا غروب ہونے سے روک دے۔ یا زمین اور چاند ستاروں کی گردش پر قابو پا سکے۔ وہ نہ سورج کی گرمی اور دھوپ کو کم یا ختم کر سکتا ہے تاکہ سردی اور گرمی پر کنٹرول ہو سکے۔ نہ حسبِ منشا بارش برسا سکتا ہے نہ بارش روک سکتا ہے۔ وہ نہ ہوا چلا سکتا ہے نہ روک سکتا ہے۔ نہ سمندر کی لہریں اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں نہ طوفانِ باد و باران پر اس کا کنٹرول ہے۔ نہ وہ کسی چیز کو پیدا کر سکتا ہے اور نہ کسی کو مرنے سے روک سکتا ہے۔ اس قدر علم و دانش کے باوجود آج تک کسی سائنسدان

اور دانشور نے کوئی جاندار تو بجائے خود ایک گھاس کا تنکا، درخت کا پتّا اور ریت کا ذرّہ پیدا نہیں کیا اور نہ پیدا کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ اشیاء کے مختلف استعمال سے وہ اشیا کو مختلف صورتوں میں ڈھال سکتا ہے لیکن غیب سے کوئی چیز وجود میں نہیں لا سکتا۔

اخلاقی قوانین کی پابندی

جب انسان کی بے بسی کا یہ عالم ہے تو کس منہ سے وہ اپنے آپ کو پیدائشی طور پر آزاد کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ طبعی قوانین کے علاوہ حق تعالیٰ نے کچھ اخلاقی قوانین بھی وضع فرمائے ہیں جو آجکل مختلف قوموں نے اپنے اپنے مذاہب سے لے کر اپنائے ہوئے ہیں۔ ان قوانین کی رو سے کوئی شخص چوری نہیں کر سکتا۔ زنا نہیں کر سکتا۔ کسی کی بیوی سے شادی نہیں کر سکتا۔ اپنی ماں بہن اور بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا۔ بازار میں جا کر جو جی چاہے اُٹھا کر کھا نہیں سکتا۔ کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ مار نہیں سکتا۔ کسی کی بے عزتی نہیں کر سکتا وغیرہ وغیرہ یہ سب اخلاقی قوانین ہی ہیں جو ہمیں مختلف مذاہب سے ورثہ میں ملے ہیں۔ اسی طرح سیاسی اور اقتصادی قوانین ہیں جن کی پابندی ہم پر لازمی ہے۔

خدا کے بنائے ہوئے اور انسان کے بنائے ہوئے قوانین

آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو شخص کوئی مشین ایجاد کرتا ہے تو اس کو چلانے اور کامیاب بنانے کے لئے قوانین بھی وہی آدمی خود بناتا ہے۔ انسان کو کسی نے سائنسدان، دانشور یا فلاسفر نے پیدا نہیں کیا۔ انسان کو اللہ تعالےٰ نے پیدا فرمایا ہے اس لئے انسان کی کامیابی کے لئے اُن قوانین پر عمل پیرا ہونا پڑے گا جو اللہ تعالیٰ نے مقرّر فرمائے انسان کے بنائے ہوئے قوانین اگر اللہ کے قوانین کے خلاف ہیں تو انسان کو تباہ و برباد کر دیں گے۔

انسانی زندگی کے دو پہلو

انسان مجموعہ ہے روح اور جسم کا۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث بعد میں آئے گی اس وقت صرف یہ بتلانا ضروری ہے کہ انسان اس وقت تک کامیاب زندگی بسر نہیں کرسکتا یا اس وقت تک منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا جب تک روح اور جسم کے تقاضوں اور ضروریات کو پورا نہ کرے۔ روح عالمِ بالا کی چیز ہے اور خدا تعالیٰ کی جانب کشش کرتی ہے جسم عالم خاکی سفلی سے تعلق رکھتا ہے اور انسان کو سفلی جانب کشش کرتا ہے۔ اس ابدی کشمکش کا نام زندگی ہے جو شخص جسمانی یا نفسانی خواہشات سے مغلوب ہوجاتا ہے وہ گمراہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ جو شخص فقط روحانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور جسمانی ضروریات کو نظرانداز کرتا ہے وہ بھی زندگی کا حق ادا نہیں کرتا ہے۔ مثال کے طور پر روح سوار ہے اور جسم گھوڑا۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے سوار اور گھوڑے دونوں کی ضروریات پوری کرنا ضروری ہیں۔ جو شخص ساری عمر گھوڑے کی پرورش میں گذار دیتا ہے اور سوار کو بھوکوں مار دیتا ہے وہ کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

اسلام کا اعتدال

سوار کو موٹا کرنا اور گھوڑے کو بھوکوں مارنا "رہبانیت" ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا رھبانیۃ فی الاسلام (اسلام میں رہبانیت نہیں ہے)۔ گھوڑے کی پرورش کرنا اور سوار کو بھوکوں مارنا نفس پرستی اور شکم پروری ہے۔ یہ بھی اسلام میں ناجائز ہے۔ اسلامی تعلیمات میں جسم اور روح دونوں کی ضروریات پورا کرنے پر زور دیا گیا برعکس دوسرے مذاہب کے کہ ان کی تعلیمات میں حقیقی فلاح ترکِ دنیا اور رہبانیت میں تھی۔

اقوامِ مغرب کی مذہب سے بغاوت کے اسباب

اقوامِ مغرب کی عیسائیت سے بغاوت کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اس میں رہبانیت کی تعلیم دی جاتی تھی اور مذموم دنیا WICKED WORLD کو تمام شر و فساد کی جڑ تصور کیا جاتا تھا۔ یہ نظریۂ حیات حضرت عیسٰے

علیہ السّلام کی زندگی کے عین مطابق تھا۔ آپ کا نہ کوئی گھر تھا نہ گھاٹ، نہ بیوی نہ بچے۔ صرف وعظ و نصیحت PERSUATION آپ کی تعلیمات کا ذریعہ تھا۔ سیاست و تمدن میں حصّہ لینا۔ بدی کو بزورِ شمشیر روکنا۔ جہاد کرنا اور اقتصادی اور سماجی نظام قائم کرنا آپ کا نصب العین نہ تھا۔ آپ کا اصول یہ تھا کہ "جو شخص تمہیں ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسری گال حاضر کر دو"۔ عیسائی مذہب میں عورت اور اس کے ساتھ ہر قسم کا تعلق باعثِ گناہ تھا۔ کیونکہ عیسائی مذہب میں تمام گناہ کی جڑ وہ ابتدائی گناہ ORIGINAL SIN تھا جو بہشت میں آدم اور حوّا سے سرزد ہوا۔ عیسائی مذہب میں دنیا کے کاروبار میں مشغول ہونا گناہ کا کام تھا۔

اسی طرح بُدھ مت اور ہندو دھرم میں بھی رہبانیت کا دور دورہ تھا اور کامیاب زندگی وہی تصوّر کی جاتی تھی جو جنگلوں اور پہاڑوں کی غاروں گذاری جائے۔ ہندو دھرم میں علم کو دبانے کا یہ عالم تھا کہ جو غیر برہمن مذہبی کتابوں کا ایک لفظ بھی سُن لیتا تو اس کے کانوں میں سیسہ ڈالا جاتا ہے۔ اُن کے ہاں سمندر کا سفر اس لئے ناجائز ہے کہ باہر سے کوئی شخص نئی چیز نہ لا سکے۔ اُن کے نزدیک جس بدقسمت بیوی کا شوہر فوت ہو جائے تو اُسے شوہر کے ساتھ آگ میں جلانا کارِ ثواب ہے۔

سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک یونان خیال کیا جاتا ہے لیکن اس کی ترقی پسندی کا یہ عالم تھا کہ حکیم افلاطون کے استاد حکیم سقراط کو اس لئے زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا کہ اس نے روح کے غیر فانی ہونے IMMORTALITY OF SOUL کا نیا ڈھونگ رچا کر نوجوانوں کو باپ دادا کے مذہب سے گمراہ کرنے کی کوشش کی۔

سائنس کُشی

عیسائیت کی ترقی پسندی کا یہ عالم تھا کہ سائنس دانوں، دانشوروں اور ماہرینِ فن کو تختۂ دار پر لٹکایا جاتا تھا۔ قدیم علوم و فنون کے بیش بہا کتب خانے ندرِ آتش کر دیئے جاتے تھے۔ خود غرض اور حریص مذہبی راہنما

خدا اور مذہب کے نام پر انسانیت کا خون بہا رہے تھے۔ شاہانِ یورپ پر پادریوں کا غلبہ تھا۔ جس کی وجہ سے عوام الناس بدترین مظالم کا شکار تھے۔ عورت اپنے شوہر کی ذاتی ملکیت تصور کی جاتی تھی جسے وہ فروخت کر سکتا تھا اور جان سے مار سکتا تھا۔ قانوناً اس کی کوئی بازپرس نہ تھی۔ یورپ پر اس بربریت، جہالت اور ظلم و ستم کا دَور تقریباً آٹھ سو سال تک مسلّط رہا۔ تاریخ میں اس دور کو دنیا کا بدترین اور تاریک دور DARK AGES کہا جاتا ہے۔ عیسائی مذہب کی یہ حالت دیکھ کر لوگوں نے بجا طور پر اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور روسیو RUSUE والٹیر VOLTAIRE لوتھر LUTHER جیسے اکابرِ یورپ کی سرکردگی میں انہوں نے مذہب کا جنازہ نکال دیا۔ اور بالکل آزاد ہو گئے۔ لیکن یہ آزادی جو اگرچہ چرچ کے بدترین سلوک کا نتیجہ تھی ان کو بہت مہنگی پڑی۔ کیونکہ مذہب سے بے لگام ہو کر دوسری حد EXTREME تک پہنچ گئے۔ یعنی افراط سے نکل کر تفریط میں مبتلا ہو گئے اور اس حالت کو پہنچے کہ جس کا آپ آج مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اہلِ مغرب کی یہ مذہب سے بغاوت، اسلام کی طرف ایک قدم ہے۔ کیونکہ اسلام بھی عیسائیت کے اُن عقائدِ باطل اور خرافات کی تردید کرتا ہے جن کے خلاف اہلِ مغرب نے بغاوت کی ہے۔ لہٰذا اہلِ مغرب اسلام کی حقانیت سے غیر دانستہ طور پر متفق ہوئے۔ اب یہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس حقیقت سے اہلِ مغرب کو آگاہ کریں اور ان کی غیر دانستہ اسلام پسندی کو اُن پر آشکارا کریں۔ اس کتاب کا مقصد بھی یہی ہے۔

اسلام کی ضیا باریاں

تاریکی، تباہی اور بربادی کے عالم میں اسلام کا آفتاب شان و شوکت سے افق پر نمودار ہوا جس سے تمام اندھیرے روشنی میں مبدّل ہو گئے۔ ظلم و ستم کا قلع قمع ہو گیا۔ انسانی مساوات و اخوّت کا دور شروع ہوا۔ روحانی ترقّی کے ساتھ مادی ترقّی جزوِ مذہب اور عبادت قرار دے دی گئی۔ عورت غلامی سے آزاد ہو کر گھر کی ملکہ بن بیٹھی۔ بدی کو بزورِ شمشیر

روکنا اور مظلوم انسانوں کی حمایت کرنے کے لئے جہاد فرض ہو گیا۔ علوم وفنون کے دروازے کھل گئے۔ قرآنِ عظیم نے آکر انسانوں کو للکارا کہ خالقِ کائنات کی کاریگریوں پر غور کرو۔ دن رات۔ سورج۔ چاند۔ ستارے۔ آسمان و زمین۔ آگ پانی مٹی اور ہوا کا مطالعہ کرو۔ اور ہر چیز میں قادرِ مطلق کی قدرت کا مشاہدہ کر کے اس کی بلندی برتری اور حاکمیت کا اقرار کرو۔ ہر چیز میں حکمت کے بے شمار اور بے اندازہ خزانوں کو تلاش کرو اور اسے بنی نوع انسان کی خدمت میں استعمال کرو۔ روحانی ترقی حاصل کر کے خالقِ کائنات تک رسائی حاصل کرو اور اس کے ساتھ براہِ راست تعلق پیدا کر کے حیاتِ ابدی حاصل کرو۔ اس کی ذات وصفات کا علم یعنی معرفت حاصل کرو اور اُس شہنشاہِ معظّم اور احکم الحاکمین کے قرب وصال کی دولت سے مالا مال ہو کر اور اس کے صفات سے متصف ہو کر دنیا میں اس کی نیابت کرو، اور خلافتِ الٰہیہ کے منصب جلیلہ کے فرائض انجام دو۔ مختصر الفاظ میں یہ ہے وہ نصب العین جو اسلام نے بنی نوعِ انسان کے سامنے رکھا اور پیغمبرِ اسلام صلیٰ اللہ علیہ وسلم کی راہنمائی میں صحابۂ کرام نے اس پر عمل پیرا ہو کر قربِ حق حاصل کیا۔ اس کی ذات وصفات معرفت حاصل کی۔ اس کے قوانین سے واقفیت حاصل کر کے خلافتِ الٰہیہ کے فرائض انجام دیئے اور انسانِ کامل کہلانے کے مستحق ہوئے۔ عصرِ حاضر کے مشہور جرمن نومسلم محمّد اسد (سابق لیوپولڈ وِیس LEOPOLD WIESS) اپنی کتاب اسلام ایٹ دی کراس روڈس ISLAM AT THE CROSS ROADS میں لکھتے ہیں،

"یورپ کے سامنے ایک ایسا تمدّن (اسلامی) نمودار ہوا جو ترقی پسند اور جاندار تھا۔ وہ بلند مقاصد کا حامل ہونے کے علاوہ تمام علوم وفنون کا گہوارہ تھا جنہیں یورپ عرصہ دراز سے فراموش کر چکا تھا۔ جو کچھ عربوں نے کیا وہ صرف یہ نہ تھا کہ انہوں نے یونانی تمدّن میں جان ڈال دی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھے اور سائنس اور علوم وفنون کی

ایک نئی دنیا پیدا کر دی۔ انہوں نے ترقی کی وہ راہیں نکالیں جس سے انسانیت اب تک ناآشنا تھی۔ روشنی کی یہ کرنیں مختلف ذرائع سے یورپ میں داخل ہوئیں۔ لہٰذا اب بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ سائنس کی دنیا نے جس میں آج کل ہم بس رہے ہیں عیسائی شہروں میں جنم نہیں لیا بلکہ ان کی بنیاد دمشق، بغداد، قاہرہ، قرطبہ، نیشاپور اور سمرقند جیسے اسلامی مراکز میں ڈالی گئی..... اسلامی تہذیب و تمدن کا یورپ پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ وہاں کا نقشہ بدل گیا اور ترقی و تعمیر اور علوم فنون کی نئی راہیں کھل گئیں۔ یورپ کے مورخین نے بجا طور پر اس دور کو یورپ کی نشاۃ ثانیہ RENAISSANCE کا نام دیا ہے۔

اسلام نے تھوڑے عرصے میں جو دنیا کی کایا پلٹ دی اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دوسرے مذاہب کے برعکس اسلام انسانی زندگی کے دونوں پہلوؤں یعنی روحانی اور جسمانی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ایک طرف مسلمان اللہ تعالیٰ کے قرب و معرفت میں ایسی بلند منازل پر پہنچے کہ جن پر آج تک کوئی بشر نہ پہنچ سکا تھا کیونکہ آخری نبیؐ کا آخری پیغام ہونے کی وجہ سے اسلام انسانی عروج کی آخری منازل کی نشان دہی کرتا ہے۔ دوسری طرف انسان کی جسمانی ضروریات پورا کرنے کی خاطر اسلام نے جو مناظرِ قدرت کا مطالعہ کرنے اور ہر چیز میں حکمت (سائنس) کا مشاہدہ کرنے کی ترغیب دی اس سے علوم و فنون اور مادی ترقی کے میدان میں مسلمانوں نے ایسی فتوحات حاصل کیں کہ دنیا ششدر رہ گئی۔ اسلام کی یہ جامعیت مندرجہ ذیل آیت میں مضمر ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (اے ہمارے رب ہمیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بہتری عطا فرما)

تہذیب مغرب کو کہاں تک اپنایا جاسکتا ہے | اوپر کے بیان سے ظاہر ہے سائنس

اسلام کا ورثہ ہے موجودہ سائنس کی بنیادیں مسلمانوں نے رکھیں لیکن چونکہ سائنس چند ماہ یا چند برس کی پیداوار نہیں ہوتی اس کی نشوو نما میں صدیاں لگ جاتی ہیں جب مسلمانوں کے لگائے ہوئے سائنس کے باغوں کے پھول اور پھل لانے کا وقت آیا تو مرورِ زمانہ کی وجہ سے مسلمانوں کی قوت کو زوال آچکا تھا اور وہ اپنی رکھی ہوئی سائنس کی بنیادوں پر محل تیار کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اُدھر چونکہ اقوامِ مغرب اسلامی دنیا کی لوٹ کھسوٹ سے مالا مال ہو چکی تھیں سائنس کی مزید ترقی کا سہرہ اُن کے سر رہا۔

لہٰذا اس وقت ہم جو مغربی تہذیب کی مذمّت کر رہے ہیں وہ اہلِ مغرب کے غلط، غیر فطری، اور خلافِ عقل، انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور نظریات کی مذمت ہے۔ سائنس اور علوم و فنون کی مذمت نہیں ہے۔ طلبِ علم کو تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلم مرد اور مسلم عورت کے لئے فرض قرار دیا۔ دیگر احادیثِ نبوی کی رُو سے عالم کی دوات کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ قابلِ قدر بتائی گئی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا علم طلب کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن اور حدیث مادی ترقّی اور علوم و فنون کے نشوونما کے خلاف نہیں ہے۔ مسلمانوں نے جب تک روحانی ترقی اور مادی ترقی میں کوششیں جاری رکھیں ساری دنیا پر چھائے رہے لیکن جب اِن سے غافل ہوئے قعرِ ذلّت میں جا پڑے۔ لہٰذا اگر اب ہمیں اپنے کھوئے ہوئے مقام حاصل کرنے کی خواہش ہے اور ضرور خواہش ہے تو ہمیں اسلام کی مقرّر کردہ ترقی کی دونوں راہوں پر گامزن ہونا پڑے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں اہلِ مغرب کے ان خلافِ عقل اور خلافِ فطرت انسان کے بنائے ہوئے نظریات اور قوانین کو بھی ترک کرنا پڑے گا جس کی وجہ سے اقوامِ مغرب تباہی و بربادی، بے چینی اور بدامنی میں مبتلا ہیں۔

اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ تہذیبِ مغرب کے کون سے نظریات

ہیں جنہوں نے دنیا کو پریشان کر رکھا ہے۔

نظریہ حکومت

آج کل دنیا میں کئی قسم کے نظریاتِ حکومت رائج ہیں۔ جو نظریہ سب سے زیادہ مقبول ہے وہ نظریۂ جمہوریت DEMOCRACY ہے جس کا بنیادی اصول ہے "لوگوں کی حکومت لوگوں کے لئے حکومت لوگوں پر حکومت" (GOVERNMENT OF THE PEOPLE BY THE PEOPLE FOR THE PEOPLE) آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس میں کائنات کے حقیقی بادشاہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جمہوریت میں اختیارِ اعلیٰ SOVEREIGNTY عوام کے ہاتھ میں ہے لیکن اسلام کے نزدیک حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام میں انسانِ کامل دنیا میں خلیفۃ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق حکومت کرتا ہے۔ لیکن جمہوریت میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو نظر انداز کر کے اختیارِ اعلیٰ عوام کالانعام (عوام جو قرآن کی رُو سے جانوروں کا درجہ رکھتے ہیں) کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ بس اسلامی نظریۂ حکومت اور مغربی نظریۂ حکومت میں یہی فرق ہے جو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور نتائج آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس مقبولِ عام نظریۂ جمہوریت نے دنیا میں کس قدر تباہی مچا رکھی ہے اگر اقتدار اعلیٰ ملک کے خواص کے ہاتھ میں دیا جاتا تو پھر بھی کوئی بات تھی لیکن رائے بالغاں ADULT FRANCHISE تو موجودہ زمانے کا مقدس ترین نظریہ ہے اس سے وہ سرِ مو تجاوز کرنے کو تیار نہیں چونکہ ہر ملک میں اکثریت جہلا اور بے وقوفوں کی ہوتی ہے۔ جمہوریت نے اعلیٰ درجہ کے مہذب، تعلیم یافتہ، عالم و فاضل شریف، متقی اور پرہیزگار دانشوروں ماہرینِ فن اور صاحبِ تصنیف اور برگزیدہ بزرگانِ دین کو پرلے درجے کی نااہل شریر، جاہل اور بے وقوف اکثریت کے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ جس طرح چاہیں اُن کے ساتھ سلوک کریں۔

خدا کا شکر ہے کہ پاکستان میں کسی حد تک جمہوریت کو مسلمان بنا دیا گیا ہے۔ یعنی آئینِ حکومت CONSTITUTION میں یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ کوئی قانون ساز

اسمبلی غیر اسلامی قانون نافذ نہیں کر سکے گی۔ لیکن پھر بھی ووٹ دینے والوں اور ووٹ لینے والوں کے لئے کوئی معیار قابلیت مقرر نہ ہونے کی وجہ سے صحیح قسم کے لوگ منتخب نہیں ہو سکتے۔ اور طوفانِ بدتمیزی کے تھمنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔

اشتراکی نظریہ حکومت جمہوریت کے علاوہ دنیا میں کئی اور قسم کے نظریات رائج ہیں مثل استبداد FASCISM اشتراکیت COMMUNISM وغیرہ فیشزم کا تو آجکل خاتمہ ہوگیا ہے لیکن کمیونزم تقریباً نصف دنیا میں رائج ہے۔ اشتراکی یا کمیونسٹ نظریۂ حکومت اگرچہ برائے نام جمہوری ہے لیکن چونکہ اس میں حزبِ اختلاف OPPOSITION کا وجود نہیں اس لئے عملاً یہ نظامِ حکومت بھی فیشزم کے مترادف ہوگیا ہے۔

نظریۂ اقتصادیات جمہوریت کے بعد اہمیت کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر نظریۂ اقتصادیات ECONOMIC THEORY ہے۔ دنیا میں کئی قسم کے اقتصادی نظریات رائج ہیں جن میں سے زیادہ مشہور سرمایہ داری CAPITALISM اشتراکیت SOCIALISM اور اسلامی نظریہ ہے۔

سرمایہ داری سرمایہ دارانہ نظام کو انگلستان کے مشہور و معروف ادیب اور مفکر کارلائل CARLYLLE نے مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

> "سرمایہ دار کو یہ فکر ہوتی ہے اس کی بیس لاکھ قمیصوں کا کوئی خریدار نہیں اور مزدوروں کو یہ فکر ہوتی ہے کہ ان کی بیس لاکھ پشتوں کو ڈھانپنے کی کوئی چیز نہیں۔"

عصرِ حاضر کے مشہور ماہرِ اقتصادیات لارڈ کینیس LORD KENYS کہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سود کا عنصر دنیا کی تمام اقتصادی خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس سے ہر پانچ چھ سال کے عرصہ میں دنیا پر نہایت شدید قسم کا بحران CRISIS مسلط ہو جاتا ہے جس سے کارخانے بند ہو جاتے ہیں۔ مزدور بھوکوں مر جاتے ہیں

اور ملک کی شادابی ختم ہو جاتی۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ملک کا فالتو ذخیرہ اشیاء تباہ کرنا پڑتا ہے یا سمندر میں پھینکنا پڑتا ہے۔ یورپ کے ماہرین اقتصادیات نے معیاری قسم کے اقتصادی نظام کا جو خاکہ تیار کیا ہے وہ اسلام کے لگ بھگ ہے۔

سوشلزم سرمایہ داری کے بعد دوسرے نمبر پر سوشلزم ہے جسے تقریباً آدھی دنیا نے اپنا رکھا ہو گا سوشلسٹ نظریۂ اقتصادیات کا موجد کارل مارکس CARL MARX ہے جو ایک جرمن یہودی تھا۔ مارکس نے نظریۂ اقتصادیات کی منطق (DIALECTICAL MATERIALISM) ہیگل HEGEL سے سیکھی لیکن جہاں ہیگل کائنات میں حکمت کا خزانہ دیکھ کر خدا کی ہستی کا قائل ہے۔ کارل مارکس خدا تعالیٰ کا منکر ہے۔ مارکس یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں حکمت ہے، اور حکمت کا وجود حکیم کے وجود کے بغیر ناممکن ہے لیکن پھر بھی خدا کا قائل نہیں۔ البتہ نیچر کا قائل ہے وہ تسلیم کرتا ہے کہ کائنات میں کوئی عقلمند قوت (INTELLIGENT FORCE) کارفرما ہے جسے وہ نیچر NATURE کا نام دیتا ہے لیکن جسے وہ نیچر کہتا ہے ہم اسے خدا کہتے ہیں فرق صرف اتنا تھا لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے عیسائی مذہب کے غیر فطری اور خلافِ عقل عقائد DOGMAS سے اہل یورپ اس قدر تنگ آ چکے تھے کہ مذہب کے نام سے ڈرتے تھے اس شدید نفرت کے عالم میں انہوں نے مذہب کو اپنی زندگی سے بالکل باہر نکال کر پھینک دیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو کارل مارکس کا نیچر یا ایک عقل مند قوت INTELLIGENT FORCE کا نظریہ عیسائیت سے اسلام کے زیادہ قریب ہے کیونکہ عیسائی مذہب میں خدا تعالےٰ کا جو تصور باندھا گیا ہے وہ ایک انسانی خدا ہے جسے عام تصاویر میں انہوں نے سفید ریش بزرگ کی شکل میں دکھایا ہے جو تخت پر بیٹھا ہوا ہے لیکن اسلامی نظریۂ الٰہیات میں خدا تعالیٰ تجسیم یعنی جسم سے پاک اور منزّہ ہے وہ ایک ایسی ہستی ہے جو انسان کے محدود عقل میں نہیں آسکتی ہے: غیر محدود کا محدود کے اندر سمانا محال ہے۔ اس لئے کیا ہی اچھا ہوتا کہ کارل مارکس

کے نظریۂ الٰہیات کو خواہ وہ کس قدر کمزور ہے اپنے منطقی نتائج تک لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس دَور ساز EPOC MAKING شخصیت کے ماننے والے کروڑوں انسانوں کو خدا تعالیٰ کی ہستی کے انکار سے بچایا جاتا لیکن یہ کام تو مسلمانوں کے کرنے کا تھا اور وہ میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ کام کون کرے۔ اسی طرح جب جرمنی کے سب سے بڑے فاضل ادیب اور شاعر گوئٹے GOETHE نے قرآنِ عظیم کا ترجمہ پڑھا تو کہا "اگر یہ اسلام ہے تو ہر عقلمند انسان مسلمان ہے" جب والٹیر VOLTAIRE سے آنحضرتؐ کے متعلق پوچھا گیا تو کہا کہ میں محمدؐ کے بوٹ کے تسموں کے برابر بھی نہیں ہوں۔

کارل مارکس کا اقتصادی نظریہ

کارل مارکس کا اقتصادی نظریہ یعنی سوشلزم تین اصولوں پر مبنی ہے:-

۱- ایک ایسی سوسائٹی کا قیام جس میں طبقات نہ ہوں (CLASSLESS SOCIETY)

۲- ایسی سوسائٹی جس میں نقدی نہ ہو (MONEYLESS SOCIETY)

۳- ایسی سوسائٹی جس میں ملک کی دولت سب لوگوں میں مساوی طور پر تقسیم کی جائے

لیکن حیرت کی بات ہے کہ سوشلزم کے بانی مبانی کے یہ تین اصول آج تک کسی سوشلسٹ ملک میں رائج نہیں ہو سکے کیونکہ یہ قدرتی طور پر ناقابلِ عمل تھے۔ اسی وجہ سے کارل مارکس کو اکثر لوگوں نے "یک طرفہ ذہنیت کا آدمی" (SINGLE TRACK THINKER) کہا ہے۔ بہرحال کمیونسٹ نظام کا سب سے بڑا مایۂ ناز (اُن کے نزدیک) کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ملک کی دولت کو عوام سے چھین کر حکومت کے سپرد کر دیا ہے لیکن اس سے بھی بُری خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ لوگوں کو بے اختیار بنا دیا گیا ہے اُن سے جذبۂ تعمیر INITIATIVE چھن گیا ہے اور ان کی حیثیت ایک بڑی مشین کے پرزوں کی سی ہو گئی ہے۔ نیز روٹی کا سوال بھی اچھی طرح حل نہیں ہوا۔ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کے فراہم کردہ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ روس میں سب سے کم آمدنی والے پختہ ور کر (مؤنث) کی ماہانہ تنخواہ

پچیس روبل اور سب سے زیادہ آمدنی والے روسی افسران کی ماہانہ تنخواہ تیس ہزار روبل ہے۔ اب پچیس اور تیس ہزار روپے کے درمیان جو فرق ہے وہی اُن لوگوں کے معیارِ زندگی کا فرق ہے یہ فرق تو شاید بڑے سے بڑے سرمایہ دارانہ نظام میں بھی نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ مزدوروں اور کسانوں پر ظلم کیا جاتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مکانوں میں رہتے ہیں اور ضروری اشیاء کی کمی سے نالاں رہتے ہیں۔ سپر وائزر لوگ ان کو بہت تنگ کرتے ہیں اور ظلم وستم کی وارداتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس امیر لوگ بڑے بڑے بنگلوں میں خوب عیش وعشرت سے رہتے ہیں۔ ان کو بنکوں میں روپیہ جمع کرنے کی بھی اجازت ہے وہ اپنے مکان بھی بنوا سکتے ہیں اور ان کی عورتیں سنہری زیورات سے لدی رہتی ہیں۔

اسلامی نظریۂ اقتصادیات

کمیونسٹ دنیا تو اس بات پر نازاں ہے کہ اس نے ملک کی دولت کو حکومت کے ہاتھ میں دے دیا ہے آگے مساویانہ تقسیم ہو یا نہ ہو اس کی ان کو پرواہ نہیں لیکن اسلام اس سے بھی آگے نکل گیا ہے بلکہ نہیں چودہ سو سال ہوئے آگے نکل گیا تھا۔ اسلام میں ملک کی دولت کا سرے سے کوئی مالک نہیں نہ عوام نہ حکومت۔ بلکہ ہر چیز کا مالک خدا عزّوجل ہے۔ قرآنِ عظیم کا یہ عظیم الشان اعلان دنیا میں گونج رہا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کی ملکیت ہے)

ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ ہے اور جو چیز کسی انسان کے پاس ہے وہ بطورِ امانت اس کے پاس ہے اور اِسے صحیح یا غلط طریق پر خرچ کرنے کی ذمہ داری اسی انسان پر ہے اور قیامت کے دن اُسے اللہ کی دی ہوئی پائی پائی کا حساب دینا پڑے گا۔ اب آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ کس قدر ارفع و اعلیٰ نظریہ ہے اس نظریے نے ہر شخص کو اپنا آپ سنتری بنا دیا ہے۔ اور حساب کتاب کے ڈر سے غلط کاری کرنے

نہیں پاتا۔

اسلامی نظام اقتصادیات کے چار ارکان

اسلامی اقتصادی نظام کی بنیاد چار ستونوں پر ہے۔ قانون وراثت۔ زکواۃ۔ امتناعِ سود اور خیرات۔ یہ وہ قوانین ہیں کہ دنیا کے مہذب سے مہذب ملک میں بھی ان کی مثال نہیں ملتی۔ برِاعظم یورپ یا امریکہ کے کسی ملک کو دیکھ لیں نہ کسی جگہ قانون وراثت رائج ہے نہ زکواۃ ہے نہ سود کی بندش۔ البتہ خیرات پر کچھ نہ کچھ یہ لوگ عمل کرتے ہیں لیکن زیادہ تر اِن ممالک کی خیرات غریب ممالک پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے اور دیگر مراعات حاصل کرنے کی خاطر ہوتی ہے۔ اِن نام نہاد مہذب ممالک میں تقسیمِ وراثت متوفی کی وصیت کے مطابق عمل میں آتی ہے تقسیمِ وراثت کا کوئی قانون نہیں ہے اس کے برعکس اسلام میں مفصل اور عدل و انصاف پر مبنی ایک ایسا قانون ہے جس میں متوفی کا کوئی رشتہ دار محروم نہیں رہتا اور اس کی موت کے بعد اس کا سارا سرمایہ تقسیم ہو جاتا ہے۔

اسلام کے ہر کام میں للٰہیت

اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت اور نظام اقتصادیات میں ہر کام اور ہر فعل کی بنیاد رفاہِ عامہ اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی ہے لیکن دوسری اقوام میں ہر کام میں خود غرضی اور نفس پرستی پائی جاتی ہے۔ یہ بہت بڑا فرق ہے زکواۃ کو لیجئے دوسرے ممالک میں زکواۃ کے مقابل انکم ٹیکس ہے لیکن انکم ٹیکس جہاں ملک کے عام خزانہ میں مدغم ہو جاتا ہے۔ زکواۃ کا مصرف آٹھ مدّوں پر ہے جو صرف غربا و مساکین پر مشتمل ہیں۔

سماجی نظام

اسلامی سماجی نظام SOCIAL ORDER کی مثال بھی دنیا میں نہیں ملتی۔ اسلامی نظام میں ہر شخص کا درجہ مساوی ہے خواہ وہ گورا ہے یا کالا۔ اعلیٰ ہے یا ادنیٰ، امیر ہے یا غریب۔ ایرانی ہے یا تورانی۔ عربی

ہے یا حبشی، بادشاہ ہے یا مزدور۔ اس کے برعکس "مہذب" ممالک میں گوروں اور کالوں کے الگ کلب گھر الگ عبادت گاہیں اور الگ معیارِ زندگی ہے۔ امریکہ میں کالی نسل کے لوگوں کے خلاف جو ظلم و ستم روا رکھا جا رہا ہے اس کی داستانیں روزمرہ اخباروں میں آپ پڑھتے ہیں۔ افریقہ میں جس نسلی امتیاز APARTHIED کی اقوامِ مغرب پرورش کر رہے ہیں کسی سے مخفی نہیں۔ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے باوجود نسلی امتیاز کو کوئی نہیں روک سکتا۔ جب اس کے خلاف اقوامِ متحدہ میں اکثریت سے ووٹ پاس ہوجاتا ہے تو پانچ بڑی قوموں میں سے کوئی آتا ہے اور اسے ویٹو VETO کر دیتا ہے۔ ہندو دھرم کو دیکھیں بھارت ماتا میں بارہ کروڑ بدقسمت اچھوت اور آٹھ کروڑ مسلمان جانوروں سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اچھوت اپنے آپ کو ہندو کہلاتے ہیں لیکن چونکہ وہ نیچی ذات سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا نہ ان کو عبادت گاہوں میں داخل ہونے کی اجازت ہے نہ شادی بیاہ میں شامل ہو سکتے ہیں نہ اُن کو کوئی رشتہ دیتا ہے نہ اُن سے کوئی رشتہ لیتا ہے اور نہ ان کو یہ اجازت ہے کہ معزز خاندان کے ہندوؤں کی کسی چیز کو چھو سکیں۔ بلکہ اگر کوئی اچھوت ذات پات کے لوگوں کو کھانا کھاتے دیکھ لیں تو کھانا پھینک دیا جاتا ہے۔ صرف اس وجہ سے اس پر ان کی ناپاک نگاہیں پڑ گئی ہیں۔ اس کے برعکس جب بلالِ حبشیؓ کسی مجلس میں داخل ہوتے تھے تو بڑے بڑے عرب سردار ادب سے کھڑے ہو جاتے تھے اس وجہ سے کہ اسلام میں بزرگی اور عزت کا معیار نیکی کے سوا کچھ نہیں قرآنِ عظیم کا اعلان ہے کہ:۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (تم میں سے اللہ کے ہاں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے)

عورت کا مقام

تہذیبِ مغرب نے عورت کو مردوں کے ہاتھ میں کھلونا بنا دیا ہے جسے وہ اپنی خواہشات پورا کرنے کی خاطر جس طرح چاہیں نچا سکتے ہیں۔ مردوں کی نظریں تر کرنے کے لئے عورت سے کپڑے اُتار لئے گئے

ہیں اور انہیں نیم برہنہ بلکہ اکثر اور خاص مقامات پر اُسے پوری طرح برہنہ کردیا گیا ہے اور اس بہیمیت اور وحشی پن کا نام آزادیٔ نسواں رکھا گیا ہے۔ نائٹ کلبوں NIGHT CLUBS اور بلیو فلموں BLUE FILMS میں جو اس مقدس دیوی اور صنفِ نازک کا حشر ہوتا ہے اُسے کوئی مہذب انسان نہ دیکھ سکتا ہے نہ سُن سکتا ہے۔

اقتصادی نظام میں متوفی کی جائیداد میں نہ بیوی کا کوئی حصہ مقرر ہے نہ بیٹی کا، نہ بہن کا نہ ماں کا نہ دادی نانی کا۔ ہاں کوئی شخص اپنی مرضی سے اپنی وصیت میں کچھ رقم مقرر کر دے تو اس کی مہربانی۔ لیکن اسلام میں ہر عورت خواہ وہ بیوی ہے بیٹی ہے بہن ہے۔ ماں ہے دادی ہے یا نانی ہے اس کے لئے متوفی کی جائداد میں درجہ بدرجہ حصہ مقرر ہے اور یہ حصہ نہ دینا گناہ ہے۔

مسئلۂ طلاق یہ "مہذب" اقوام آج اسلام کی دیکھا دیکھی میں اپنے ملکوں میں قانونِ طلاق پاس کر رہی ہیں اور بعض ممالک میں آج تک یہ قانون نافذ نہیں ہو سکا لیکن اسلام میں آج نہیں آج سے چودہ سو سال پہلے قرآنِ عظیم میں قانونِ طلاق نافذ ہو چکا تھا۔ اب بھی جن ممالک میں طلاق جائز قرار دی گئی ہے وہ بھی صرف عدالت میں جاکر طلب کی جاسکتی ہے جس سے بڑی خرابی اور بدنامی ہوتی ہے لیکن اسلام میں ہر بالغ شخص کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے۔ صرف عورتوں کے لئے جو عام طور پر جذباتی ہوتی ہیں یہ ضروری ہے کہ عدالت میں جاکر طلاق حاصل کریں۔ اگر ان کو طلاق کا کھلا حق دے دیا جاتا تو روزانہ کئی بار طلاق عمل میں آتی۔

تعددِ ازدواج آج کل تعددِ ازدواج POLYGAMY نزاعی مسئلہ بنا ہوا ہے۔ چونکہ تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں اس لئے یہاں صرف تعدد ازدواج کے متعلق چند غیر مسلم مفکرین اور ماہرین کی رائے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سنڈے کرانیکل (SUNDAY CHRONICAL) میں ایک عورت نے لکھا ہے کہ:۔

"اگر ہر آدمی ایک ایک عورت سنبھال لے تو پھر بھی برطانیہ میں
چالیس لاکھ عورتیں بچ جاتی ہیں جن کو کوخاوند نہیں ملتا۔"
ڈاکٹر میک فارلانس (DR. MACFARLANCE) اپنی کتاب
کیس آف پالیگیمی (CASE OF POLYGAMY) میں لکھتے ہیں:۔
"مذہبی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے یا سماجی نقطۂ نگاہ سے تعدّدِ
ازدواج تہذیب و تمدّن کے بلند سے بلند معیار کے مطابق ہے۔
اگر تعدد ازدواج پر عمل نہ کیا جائے تو نتیجہ طوائف گردی، کثرتِ زنا
اور بے حیائی کے سوا کچھ نہیں۔"
ڈاکٹر جارج ریلے سکاٹ (G.R. SCOTT) لکھتے ہیں کہ:
"انسان فطری طور پر کثرت ازدواجی (POLY GAMOUS)
ہے اور یہی تمدن کے ارتقا کا تقاضا ہے۔"
ڈاکٹر لی۔ بان (LEBON) جو ماہرین علم صنفیات SEXOLOGY
میں شمار ہوتے ہیں لکھتے ہیں:۔
تعدّدِ ازدواج سے بہت سے جرائم کا انسداد ہوسکتا ہے مثلاً
قحبہ خانہ، خفیہ مردانہ اور نسوانی امراض (VENEREAL —
DISEASES) — اسقاطِ حمل (ABORTIONS)
بے باپ کے بچوں کی لعنت۔ اور بے شوہر خواتین کی کثرت۔"
ڈاکٹر میکس نارڈن (MAX NORDAN) لکھتے ہیں:
"ایک بیوی کے قانون کے باوجود ہر ملک میں لوگ متعدد بیویاں
رکھتے ہیں جو غیر قانونی ہوتی ہیں۔ لاکھوں انسانوں میں ایک انسان
ایسا ہوگا جو صرف ایک بیوی پر اکتفا کرتا ہوگا۔"
ان ماہرینِ فن کی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ تعدّدِ ازدواج کا قانون بنی نوع انسان

کے لئے بڑی رحمت ہے جس میں بڑے بڑے اخلاقی اور سماجی جرائم کے انسداد کا راز مضمر ہے۔

روحانی ترقی

مختلف مذاہب اور تمدنوں کے دُنیادی امور کا اسلامی امور سے مقابلہ کر کے آپ نے اسلام کی حقانیت اور برتری کا ملاحظہ تو کر لیا۔ اب آئیے انسانی زندگی کے دوسرے اور زیادہ اہم پہلو یعنی روحانی ترقی کا بھی اندازہ کر لیں کیونکہ یہی اس کتاب کا حقیقی موضوع ہے اور باقی امور کو صرف ضمناً اور تقابل کی خاطر درج کتاب کیا گیا ہے۔ کم علم اور بعض کج فہم اور متعصب غیر مسلم مصنفین تو یہ الزام لگاتے ہیں کہ اسلام روحانیت سے بالکل خالی ہے اور مسلم صوفیا نے روحانیت میں جو کچھ حاصل کیا دوسرے مذاہب سے حاصل کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث میں قربِ الی اللہ اور معرفتِ حق کی جن بلند منازل اور مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے اور جن منازل اور مقامات تک آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے نقشِ قدم پر چلنے والے صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین اور دیگر اکابر اولیا پہنچے ہیں اُن سے دیگر مذاہب کی سطحی اور ادنیٰ قسم کی روحانیت کی کوئی نسبت ہی نہیں۔ اس مضمون پر مفصل بحث ایک علیحدہ باب میں آ رہی ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ جو تھوڑے سے عرصے میں اسلام نے اس قدر ترقی کی کہ ساری دُنیا کو روزِ روشن کی طرح منوّر کر دیا اور علوم و فنون میں بے نظیر ترقی کر کے ساری دنیا کو تہذیب و تمدن سکھایا اس کی وجہ یہی اور صرف یہی تھی کہ ہمارے اسلاف کو روحانی ترقی میں کمال حاصل تھا۔ روحانی قوت کے بل بوتے پر مسلمانوں نے اپنے سے کئی گنا افواج پر فتوحات حاصل کیں۔ روحانی قوت سے کائنات کو تسخیر کیا۔ روحانی قوت سے علوم و فنون میں کمال حاصل کیا، روحانی قوت سے ساری دنیا پر غالب آ گئے اور روحانی قوت کے ذریعے پرواز کر کے ذاتِ حق سے واصل ہوئے اور بمصداق حدیث تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہو کر دنیا میں خلیفۃ اللہ اور

نائبِ حق کی حیثیت سے حکمرانی کی۔ کشف و کرامات کی دولت سے مالامال ہوئے اور حق تعالےٰ کے نزدیک اور مخلوقات کے ہاں ایسا مقام پیدا کیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

اسلام سراسر روحانیت ہے۔ روحانیت کے بغیر اسلام خالی ڈھانچہ اور مردہ جسم ہے۔ اسلام میں تمام عبادات کی غرض و غایت تزکیۂ نفس ہے اور تزکیۂ نفس کی غرض و غایت حصولِ قرب و وصالِ حق ہے۔ اسلام میں تمام کاموں، پیشوں اور علوم و فنون کی غرض و غایت اللہ تعالےٰ تک رسائی حاصل کرنا ہے اس لحاظ سے دُنیا کے تمام کام منزلِ مقصود نہیں بلکہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے ذرائع ہیں اور منزلِ مقصود اللہ ہے۔ قرآنِ عظیم کہتا ہے: وَاِلٰی رَبِّکَ مُنۡتَہٰہَا (اور تیرا انتہائی مقام اللہ تک رسائی ہے)

روحانیت ایک سائنس ہے

چونکہ آنحضرتؐ کے زمانۂ مبارک میں مختلف علوم و فنون کو مرتب کرنے اور ترتیب دینے کی فراغت نہ تھی اس لئے آپ کے بعد جس طرح مسلمانوں نے قرآن و حدیث میں دیئے ہوئے اصولوں کی بنیاد پر مختلف علوم و فنون مثل اصُول قرآن، اصول حدیث، اصولِ فقہ۔ علم کلام۔ علم بیان۔ علم صرف و نحو وغیرہ کو باقاعدہ علوم (سائنس) کی شکل میں مرتب کیا۔ علم روحانیت کو بھی انھوں نے باقاعدہ سائنس کی شکل میں مرتب اور مدوّن کیا جس سے آنے والی نسلوں کا کام آسان ہوگیا۔

روحانیت کی منازل اور مقامات کو آدمی اس وقت سمجھ سکتا ہے جب اُسے حق اللہ کی ذات و صفات کے متعلق کچھ علم ہوجائے اور انسان کی حقیقت بھی معلوم ہوجائے۔ لہٰذا علم روحانیت پر بحث کرنے سے پہلے ہم ایک باب میں حق تعالےٰ کی ہستی اور حقیقت کے متعلق کچھ بیان کریں گے اور دوسرے باب میں حقیقتِ انسان سے قارئین کو آگاہ کریں گے۔ اس کے بعد امید ہے کہ بندہ اور معبود کے درمیان جو تعلق ہے وہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا اور مقصدِ حیات بھی واضح ہوجائے گا۔

دوسرا باب

اسلام میں ہستیٔ باری تعالیٰ کا تصور

(CONCEPTION OF GOD IN ISLAM)

ہستی باری تعالیٰ کے متعلق کچھ کہنے اور سننے سے پہلے ہم سب کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ دنیا میں یہ مضمون یا مسئلہ سب سے زیادہ مشکل، ادق، نازک اور لطیف ہے۔ یہ مسئلہ زیادہ مشکل اس لئے بن گیا ہے کہ موجودہ زمانے کے لوگ اس مسئلے کو روایتی وجدان سے نہیں جو اس کا حقیقی حل ہے بلکہ عقل سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انسانی عقل محدود ہے۔ عقل کا انحصار حواس خمسہ پر ہے جو خود محدود ہیں۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی ہستی لامحدود، لاانتہا، اور بے پایاں ہے تمام منطق اور معقولات اس بات پر متفق ہے کہ لامحدود محدود میں نہیں سما سکتا۔

(INFINITE CANNOT BE CONTAINED BY FINITE)

اس بنیادی اصول کو ذہن نشین کر لینے سے باقی امور سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اسلام یا ہستیٔ باری تعالیٰ عقل کے خلاف ہے۔ عقل کے خلاف ہونا اور بات اور عقل سے ماوری اور بلند تر ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ ہمارا عقل اس بات کی گواہی تو ضرور دیتا ہے کہ قانونِ علت ومعلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) کے تحت دنیا کی کوئی چیز خود بخود وجود میں نہیں آسکتی۔ کائنات کا

وجود اور اس کے ہر ذرہ میں عظیم الشان حکمت (INTELLIGENCE) کا وجود اس بات کا پتہ بتاتا ہے کہ کوئی عظیم الشان حکیم پسِ پردہ ضرور کارفرما ہے لیکن اس حکیم کی ہستی اس قدر ارفع و اعلیٰ اور لامحدود ہے کہ انسان کے محدود عقل کے لئے اس کا پوری طرح سمجھنا ناممکن ہے۔

منطقی استدلال قانونِ علت و معلول کے مطابق بحث کرنے کا نام منطقی استدلال ہے اگرچہ استدلال سے حقیقت پوری طرح آشکارا نہیں ہوسکتی تاہم اس کے ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔ ایک دفعہ ایک عیسائی نے راقم الحروف سے سوال کیا کہ ثابت کرو کہ خدا ہے۔ ہم نے کہا اگر ہم آپ سے یہ سوال کریں کہ ثابت کرو کہ جس کرسی پر آپ بیٹھے ہیں اس کا کوئی بنانے والا ہے تو آپ میری عقل کے معیار کے متعلق کیا کہیں گے۔ آپ یہی کہیں گے کہ پاگل خانہ کی رونق بننے کے قابل ہے۔ اس نے کہا بالکل درست ہے۔ ہم نے کہا جب اس معمولی سی کرسی جس میں صرف یہ حکمت ہے کہ آدمی کو زمین سے دو فٹ اوپر اُٹھا رکھتی ہے، کے بنانے والے کی ہستی کے انکار کرنے والے کا مقام آپ کے نزدیک پاگل خانہ ہے تو آپ خود فرمائیں کہ اس پوری کائنات جس کے ذرّہ ذرّہ میں علم اور حکمت کے خزانے بھرے پڑے ہیں اس کائنات کے خالق کی ہستی کا انکار کرنے والے کا مقام کہاں ہوگا۔ اس نے کہا یہ دنیا تو ہزاروں سال پرانی ہے۔ ہمیں کیا معلوم کس طرح وجود میں آئی۔ ہم نے کہا آپ اس اہم سوال کا جواب دینے سے کیوں راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ یہ کائنات کس طرح وجود میں آئی سوال یہ ہے کہ یہ کائنات اپنے عظیم الشان حکمت کے خزانوں کے ساتھ آپ کے سامنے ہے۔ ادھر تو آپ مسلمانوں کے کشف و کرامات اور خوارق و عادات کے قصوں پر یقین نہیں کرتے کیونکہ یہ قانون علتِ معلوم کے خلاف ہیں اور دوسری طرف آپ اتنی بڑی کائنات کے کرشموں اور عجیب و غریب حکمت و سائنس کے خزانوں کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ خود بخود وجود میں آئے ہیں یہ کیا حماقت ہے۔ اس کا جواب اس سے بن نہ آیا اور اُٹھ کر چلا گیا۔

ایک روسی سے بحث اسی طرح ایک دفعہ ریل گاڑی میں ایک روسی سے بحث ہوئی اس نے کہا آپ ثابت کریں کہ خدا ہے۔ ہم نے کہا کہ آپ ثابت کریں کہ خدا نہیں ہے۔ اس نے کہا یہ کیوں ہم نے کہا اس لئے کہ جب آپ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ اس ریل گاڑی کو کوئی بنانے والا نہیں ہے تو اس ساری کائنات کے بنانے والے کی کس طرح نفی کر سکتے ہیں۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو گیا اور سوچتا رہا۔

اسحاق نیوٹن (ISSAC NEWTON) کا واقعہ انگلستان کے مشہور مفکر ڈاکٹر نیوٹن نے ایک ایسی مشین بنوائی تھی جو نظام فلکی کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھا۔ اس مشین کو چلانے سے تمام مصنوعی ستارے زمین۔ سورج اور چاند۔ حرکت میں آجاتے تھے اور اپنے اپنے راستے پر چلتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک دہریہ ATHEIST وہ مشین دیکھنے گیا۔ مشین دیکھ کر اس نے نیوٹن سے دریافت کیا کہ یہ مشین کس نے بنائی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ کسی نے نہیں بنائی خود بخود بن گئی ہے۔ اس پر دہریے نے کہا یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ نیوٹن نے کہا جب نظام فلکی کا ایک چھوٹا سا لوہے کا بنا ہوا نمونہ خود بخود نہیں بن سکتا تو وہ اصلی اور اس سے کہیں زیادہ بڑا اور مکمل نظام فلکی کس طرح خود بخود وجود میں آ سکتا ہے۔ یہ بات سن کر وہ ذاتِ حق کا قائل ہو گیا۔

امام ابو حنیفہ امام ابو حنیفہؒ نے بھی دہریوں کی ایک جماعت کو اسی طرح مسلمان کیا تھا دہریوں کی ایک جماعت آپ کے ساتھ ہستی باری تعالیٰ پر بحث کرنے آئی۔ آپ نے فرمایا کل بارہ بجے آنا چنانچہ وہ دوسرے دن بارہ بجے آپ کے مکان پر پہنچ گئے لیکن آپ مکان پر نہ تھے۔ دو تین گھنٹے دیر کر کے آپ گھر آئے اور ان لوگوں سے کہا کہ معاف کیجئے مجھے دیر ہو گئی وجہ یہ تھی کہ میں دریائے دجلہ کی دوسری طرف گیا ہوا تھا جب واپس آیا تو دریا پر کوئی کشتی نہ تھی میں ناچار کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ لکڑی کے تختے دریا کے کنارے پر خود بخود آ گئے اور آپس میں جڑ کر کشتی کی شکل اختیار

کرلی۔ اس کے بعد وہ کشتی پانی میں داخل ہوگئی اور چل کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی جب میں اس میں بیٹھا تو وہ خود بخود چل پڑی اور مجھے دریا کے پار پہنچا دیا۔ یہ سُن کر دہریوں نے کہا کہ مسلمانوں کے امام جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ آپ نے فرمایا جھوٹ نہیں بالکل سچ ہے۔ انھوں نے کہا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر یہ ممکن نہیں تو کائنات کا یہ عظیم کارخانہ کیسے خود بخود چل رہا ہے۔ اس پر وہ خدا کی ہستی کے قائل ہو گئے اور اسلام قبول کرلیا۔ یہ تو تھا منطقی استدلال۔ لیکن جیسا اوپر کہا جاچکا ہے منطقی استدلال کافی نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے حقیقت کا علم تو ہوجاتا ہے لیکن حقیقت سامنے نہیں آتی۔ منطقی استدلال کی کمزوری کو دیکھ کر حضرت مولانا رومؒ نے فرمایا ؎

گر بہ استدلال کارِ دیں بُدے
فخرِ رازی رازدارِ دیں بُدے

(اگر منطقی اور فلسفیانہ استدلال سے کام بنتا تو امام فخرالدین رازی دین کا راز سمجھ لیتے)

اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو سمجھنے کے لئے منطقی استدلال کافی نہیں بلکہ وجدان کی ضرورت ہے۔

امام فخرالدین رازی کے انتقال کا واقعہ

امام فخرالدین رازی بڑے منطقی تھے۔ اگرچہ آپ نے ایک صوفی بزرگ سے بیعت کی تھی لیکن اس کوچہ میں زیادہ کام نہ کرنے کے باعث دولت قرب و معرفت سے بے بہرہ تھے جب آپ کے انتقال کا وقت آیا تو شیطان پہنچ گیا۔ اس نے کہا ثابت کرو کہ خدا ہے۔ آپ نے دلیل دی۔ شیطان بھی بڑا عالم ہے، اس نے وہ دلیل رد کردی۔ آپ نے دوسری دلیل دی۔ اُس نے وہ بھی رد کردی۔ آپ نے تیسری دلیل دی اُس نے وہ بھی رَدّ کردی اسی طرح آپ نے ننانوے دلائل دیئے اور شیطان نے سب کے سب رَدّ کردیئے۔ اب آپ کا چہرہ سیاہ ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر آپ کے مرشد نے جو کسی دوسرے شہر میں رہتے تھے بلند آواز سے کہا: "تم یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میں نے خدا کو بلا دلیل مانا ہے۔" یہ بات امام صاحب

نے سُن لی اور فوراً کہا کہ میں نے خدا کو بلا دلیل مانا ہے۔ یہ سُن کر شیطان بھاگ گیا۔

قانونِ شہادت

قرآن عظیم میں جہاں منطقی دلائل سے کام لیا گیا وہاں اس سے ارفع و اعلیٰ تین قسم کے اور ثبوت بھی مہیا کئے ہیں۔ منطقی استدلال کے بعد دوسرا ثبوت قانونِ شہادت ہے۔ یعنی ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام جو تمام لوگوں میں سے سب سے زیادہ راست باز، متقی و پرہیزگار صدیق اور امین شمار کئے جاتے رہے ہیں خدا تعالیٰ کے قرب میں رہ کر اور اس کی ہستی کا مشاہدہ کر کے لوگوں کے سامنے ذاتی شہادت پیش کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے۔ عقلِ سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ان بزرگ ہستیوں کی شہادت قبول کر لی جائے۔ اگر قانونِ شہادت پر عمل نہ کیا جائے تو ہم زندگی میں ایک اِنچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جب کسی جج کے سامنے قتل کا مقدمہ پیش ہوتا ہے تو ایک آدمی کو پھانسی دینے جیسے اہم کام کے لئے اُسے صرف دو گواہوں کی چشم دید شہادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب دو معمولی قسم کے آدمیوں کی شہادت ایک آدمی کی جان لینے کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ان راست باز، پاکباز اور متقی و پرہیزگار انسانوں کی شہادت نہ مانی جائے جو ہر زمانے میں مسلسل آتے رہے ہیں اور یہی ایک پیغام دیتے رہے ہیں کہ اللہ برحق ہے

علم الیقین

قانونِ شہادت کا اعتبار کرنے کا نام شریعت کی اصطلاح میں علم الیقین ہے یعنی علم کا وہ درجہ جو کسی دیکھنے والے کی شہادت کے بعد حاصل ہو۔ اس قسم کے ایمان بالغیب کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ آپ کے سر میں سر میں درد ہے، آپ ڈاکٹر کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ میرے سر میں درد ہے، دوا دیجئے۔ اگر ڈاکٹر آپ کی بات پر اعتبار نہ کرے اور اس بات کا ثبوت طلب کرے تو پھر کیا ہو گا۔ آپ علاج سے محروم رہ جائیں گے۔ اسی طرح جب ڈاکٹر آپ کو دوا دیتا ہے تو آپ بھی اس پر اعتبار کرتے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ ثابت کیجئے کہ اس دوا سے مجھے آرام آجائے گا۔ اگر آپ کہیں بھی تو علاج سے محروم رہ جائیں گے۔ غرض علم الیقین یعنی قانونِ شہادت کے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں

ہو سکتا۔

عین الیقین

علم الیقین کے بعد ایمان کا دوسرا درجہ ہے جسے عین الیقین کہتے ہیں۔ عین الیقین سے یہ مراد ہے کہ کسی چیز کو دیکھ کر اس کا یقین کرنا۔ چنانچہ قرآنِ عظیم میں منطقی دلائل اور علم الیقین کے بعد تیسری قسم کا ثبوت عین الیقین ہے۔ قرآن و حدیث پر عمل پیرا ہونے اور روحانی ماہرینِ فن کی ہدایات اور تربیت کے بعد آدمی روحانی ترقی کی اس سٹیج (منزل) پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ حقیقتِ باری تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے یعنی باطنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ایمان باللہ کے اس درجہ کو عین الیقین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

حق الیقین

اسلام نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اور ایمان کے اس بلند ترین درجہ تک بنی نوع انسان کی راہنمائی کی ہے جسے علم روحانیت کی اصطلاح میں حق الیقین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حق الیقین کا مطلب ہے حق تعالےٰ کو اپنے اندر محسوس کرنا۔ علم الیقین کی مثال اس شخص کے ایمان کی ہے جس نے آگ نہیں دیکھی لیکن سُنا ضرور ہے کہ آگ جلاتی ہے۔ عین الیقین کا مرتبہ اُس شخص کو حاصل ہے جس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ آگ جلا رہی ہے اور حق الیقین کا مقام یہ ہے کہ آدمی آگ میں ہاتھ ڈال کر دیکھ لے کہ آگ جلاتی ہے۔

سب سے اہم بات

سب سے اہم بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ عقلی اور منطقی ثبوت کو اسلام میں کافی نہیں سمجھا گیا کیونکہ اس سے خدا تعالیٰ کی ہستی انسانی عقل کی ایجاد ہو جاتی ہے اور جو چیز عقل کی اختراع ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ اپنی عقل کی ایجاد کردہ ہستی پر یقین لانا شرک ہے کیونکہ وہ عقل کا تراشیدہ بُت ہوتا ہے خدا نہیں ہوتا اس لئے اسلام عقلی دلائل سے زیادہ قانونِ شہادت کو ترجیح دیتا ہے اور قانونِ شہادت پر بھی اکتفا نہ کرتے ہوئے مزید در مزید ثبوت بہم پہنچاتا ہے یعنی حقیقت کو اس کی آنکھوں کے سامنے آشکارا کرتا ہے اور مزید برآں قلب کے اندر اس کی ہستی کو محسوس کراتا ہے بلکہ

جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو جائے گا طالبِ حق ذات وصفات میں فنا ہو جاتا ہے اور دوئی مٹ جاتی ہے۔ اس سے بڑھ کر ہستیِ باری تعالےٰ کے متعلق ثبوت نہ دنیا میں ہے نہ ہو سکتا ہے نہ ہو گا کیونکہ فنا کا درجہ آنکھوں سے دیکھنے سے بھی زیادہ ہے اور دُنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے آپ کو اس درجہ قرب و وصال حاصل ہو کر وہ اور آپ ایک ہو جائیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق اس قسم کا یقین محکم دنیا کی ہر چیز کے متعلق یقین سے قوی تر، بلند تر اور مضبوط تر ہے۔ بلکہ یہ یقین آپ کی اپنی ہستی میں یقین سے بھی محکم تر ہوتا ہے کیونکہ قرب و وصالِ حق کی بلند منازل میں آپ کی موہوم اور اعتباری ہستی گم ہو جاتی ہے اور ذاتِ باری تعالیٰ باقی رہ جاتی ہے۔ اب بتلایئے کہ اس سے زیادہ کیا ثبوت چاہیئے۔ اسی بات کو دیکھ کر عارف رومیؒ چلا اُٹھتے ہیں ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
گر دلیلت باید از وے رومتاب

(آفتاب کا ثبوت خود آفتاب ہے۔ اگر سورج کی ہستی کا ثبوت چاہتے ہو تو اُس کی طرف دیکھو)

حق تعالیٰ اقرب اور اظہر ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتے

بھلا حق تعالیٰ جیسی عظیم الشان ہستی بھی آنکھوں سے چھپ سکتی ہے وہ تو شان و شوکت سے ہر جگہ دھن دھنا کر موجود ہے چھپ کیسے سکتا ہے اس لئے عارفین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے نظر نہ آنے کے دو وجوہات ہیں ایک یہ کہ وہ اظہر ہیں دوسرے وہ اقرب ہیں۔ اظہر کے معنی ہیں نہایت ہی سخت ظہور پذیر اور اقرب کے معنی ہیں نہایت ہی قریب جب ایک ہزار کینڈل پاور CANDLE POWER کے بلب کی طرف آپ نہیں دیکھ سکتے اور سورج کی روشنی سے آپ کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں تو اس سورج جیسے لاکھوں سورج پیدا کرنے والی ہستی کو آپ کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ سائنس کا انکشاف جو حقیقت پر مبنی ہے تو یہ ہے کہ روشنی نظر ہی نہیں آتی۔ روشنی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب مادی اشیاء پر پڑتی ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ جو مجسم نور اور بھرپور اور شدید نور ہے۔ آپ کو کیسے نظر آ سکتا ہے۔

نیز جو چیز قریب تر ہوتی ہے کم نظر آتی ہے۔ ناک اور پلکیں اس لئے نظر نہیں آتیں کہ آنکھوں سے قریب ترین فاصلہ پر ہیں۔ آپ کسی تصویر کو آنکھوں کے بالکل قریب کر دیں تو نظر نہیں آئے گی۔ اب چونکہ باری تعالیٰ انسان سے اس قدر قریب ہے کہ دنیا کی کوئی اور چیز اتنی قریب نہیں ہے حتیٰ کہ اس کے اپنے وجود اور اپنی جان سے بھی اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ قریب ہے۔ قرآن عظیم کہتا ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ (ہم انسان سے اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں) جب یہ بات ہے تو آپ اُسے کس طرح دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ نہیں نہیں وہ تو آپ کے اندر موجود ہے اور بڑی قوت اور شان سے موجود ہے۔ آپ کس طرح اس سے بے خبر رہ سکتے ہیں حقیقت یہ ہے اس کی ذاتِ پاک سے کوئی شخص بلکہ کوئی جاندار اور کوئی چیز بے خبر نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ ذاتِ حق ہر چیز اور ہر جاندار کی ہستی کا منبع اور مصدر ہے۔ ہر چیز اور ہر جاندار اس کے عشق اور اس کی تسبیح میں مشغول ہے غافل ہے تو صرف عقل غافل ہے۔ اس لئے عرفاءٗ کا قول ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ثبوت کی ضرورت عقل کو ہے عشق کو نہیں کیونکہ عقل ہی سب سے بڑا حجاب ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ کشف زیادہ تر چھوٹے بچوں، کم عقل اور مجذوب لوگوں کو اور جانوروں کو ہوتا ہے۔ لیکن وجدانی طور پر ہر شخص عشقِ حق میں سرشار ہے۔ عقل کو دور کر کے عشق کی غلامی میں آؤ تو حقیقت فوراً آشکارا ہو جائیگی حق تعالیٰ قلب سے یعنی قلب کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ عقل کی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اقبالؔ نے نیٹشے NITCHE کے حق میں خوب کہا ہے ع

قلبِ او مومن دماغش کافر است

(اس کا قلب مومن اور دماغ کافر ہے) اور یہی حال ہر شخص کا ہے۔ ہر شخص فطری طور پر عشقِ حق میں سرشار ہے کیونکہ اس کی تخلیق ہی اسی طرح ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ عظیم میں فرماتے ہیں فَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ (میں نے آدم میں اپنی روح پھونکی) پس روحِ حق جو انسان میں ہے کا تقاضا یہ ہے کہ وصلِ حق کے لئے بے چین رہے۔ اس

لئے اگر معاملہ عقل سے نکال کر عشق پر اور دماغ سے نکال کر قلب پر چھوڑ دیا جائے تو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ ثبوت ہر شخص کے اندر موجود ہے۔ اللہ فرماتے ہیں :

لَا یَسَعُنِیْ ارضی ولا یسعنی سمائی ولکن یَسَعِنِی قلبُ عبدِیِ المومن

(نہ میں اپنی زمین میں سما سکتا ہوں نہ اپنے آسمانوں میں سما سکتا ہوں لیکن اپنے مومن بندہ کے قلب میں سما سکتا ہوں) اب آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ عبدِ مومن کے قلب کی کیا وسعت ہوگی۔ نیز قرآن عظیم میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں :

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

(اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے)۔ امام غزالیؒ نے نور کے معنی نورِ حیات اور نورِ وجود کے لئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ ساری کائنات کے لئے بمنزلۂ جان ہیں۔ اس کے فیضِ وجود سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ موجود ہے۔ وہی ہر چیز کی اصل اور ہر چیز کا مصدر اور ہر چیز کا روحِ رواں ہے۔ کیا کوئی احمق سے احمق کسان جو رات دن چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کے ذریعے دریا کے فیضِ عام سے سیراب ہو رہا ہے کبھی یہ کہہ سکتا ہے کہ ثابت کرو کہ دریا کا وجود ہے کیونکہ دریا کا وجود تو اس کی زندگی ہے وہ ہر آن ہر لحظہ دریا کے فیض میں بس رہا ہے۔ اس کی کھیتی اس کی پیداوار۔ اس کی خوراک۔ اس کے جانور۔ اس کا دودھ اس کا مکھن اس کا گوشت اس کا پوست سب کے سب دریا بادشاہ کے فیضِ عام کا نتیجہ ہیں۔ پھر وہ کس منہ سے کہے گا کہ دریا کا وجود ثابت کرو۔ اگر کہے گا تو اس کے دماغ میں فتور ہے۔ اسی طرح کائنات کی ہر چیز ہستیِ باری تعالےٰ کے فیضِ وجود سے وجود میں آئی ہے اور اسی حی القیوم سے زندہ اور قائم ہے۔ اس کی صفتِ قیومیت اور صفتِ حیات ہر چیز میں جاری، ساری اور طاری ہے وہ کائنات کے لئے بمنزلۂ روح اور جان ہے۔ جو لوگ اسے آیۂ پاک الرحمٰن علی العرش استویٰ کے مطابق عرش پر مقیم سمجھتے ہیں وہ عرش کی حقیقت کو قرآن سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ قرآن کہتا ہے وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اس کے عرش و کرسی میں آسمان اور زمین شامل ہیں) جب یہ حال ہے تو پھر وہ کائنات سے

کس طرح الگ تھلگ ہو کر رہ سکتا ہے۔ ساری کائنات اس کا عرش ہے۔ نیز فرمایا وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْط (وہ ہر شے پر محیط ہے یعنی ہر چیز اس کے وجود میں شامل ہے) لہٰذا کیا کبھی جسم بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ روح کہاں ہے روح تو آپ کی جان ہے اسی سے آپ دیکھتے ہیں سنتے ہیں چلتے ہیں پھرتے ہیں اگر روح نہ ہو تو جسم بے جان ہو کر قبر میں دھکیل دیا جاتا ہے لہٰذا جو لوگ اپنی روح اور کائنات کا ثبوت مانگتے ہیں وہ عقل کے فتور کی وجہ سے مانگتے ہیں کیونکہ آپ کا وجدان نہ روح سے غافل ہے نہ حق تعالےٰ سے کیونکہ وہی اس کی جان ہے اور اسی سے وہ زندہ ہے اور شب و روز اس کے مشاہدہ میں ہے لیکن حضرت عقل ہے کہ تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے تمام مذاہب کی تعلیمات کا لب لباب یہی ہے کہ عبادات ایثار اور قربانیوں کے ذریعہ تزکیہ نفس کیا جائے اور عقل سے پیچھا چھڑا کر عشق کو اپنا راہ نما اور رہبر بنایا جائے۔ مولانا روم نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

مرحبا اے عشقِ خوش سودائے ما — اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموسِ ما — اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد — کوہ در رقص آمد و چالاک شد

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت — ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

شرحِ عشق ار من بگویم بر دوام — صد قیامت بگذرد آں نا تمام

درد حاصل کن کہ درماں درد تست — در دو عالم داروئے جاں درد تست

کفر کافر را و دیں دیندار را — ذرۂ دردت دلِ عطّار را

لہٰذا عقل کو ثبوت کی جو ضرورت تھی او پر دئے ہوئے چار قسم کے ثبوت سے پوری کر دی گئی۔ عشق کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ عشق خود ثبوت ہے معشوق نہ ہو تو عشق کہاں۔ عشاق جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ دوست کا رُخِ انور اس قدر روشن ہے کہ اس پر نظر نہیں جم سکتی۔ عیاں را چہ بیاں۔ ظاہر کو ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ اس کے قرب و وصال کے شوق میں ہر دل تڑپ رہا ہے اور اسی قرب و وصال کی منازل طے کرتے کرتے زندگی

تمام ہو جاتی ہے نہ دوست کے حسن و جمال کی کوئی حد ہے نہ عاشق کے ذوق و شوق کی ؎

نہ حُسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنۂ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ دوست کے حسن و جمال کی کوئی حد ہے نہ سعدیؔ کے جذبۂ شوق کی۔ بس حال یہ ہے کہ استسقا کے مریض کی طرح عاشق پانی پیتے پیتے مرجائے گا لیکن دریا اُسی طرح چلتا رہے گا) محبوبِ حقیقی کی محبت میں ہر شخص والہ و شیدا ہے لیکن اُسے عقل نے گمراہ کر رکھا ہے اس لئے وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس کی یہ تڑپ اور تشنگی کس وجہ سے ہے۔ مولانا رومؒ اپنی کتاب فِیهِ مَافِیه میں فرماتے ہیں کہ یہ جو ہر شخص کسی نہ کسی چیز کی طلب میں دیوانہ ہے کوئی دولت جمع کر رہا ہے کوئی طلب علم میں مشغول ہے کوئی طلبِ جاہ و حشمت میں سرگرداں ہے کوئی کھیتی باڑی میں مصروف ہے کوئی کلبہ رانی میں، کوئی شہوت رانی میں دراصل یہ طلب حق ہے جو اسے کشاں کشاں ہر جگہ لئے پھرتی ہے اور کسی جگہ چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ عقل کے حجاب نے اُسے محبوب سے ناآشنا کر دیا ہے اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ میرے اندر کس کی طلب ہے لیکن طلب ایسی ہے کہ آرام نہیں کرنے دیتی۔ یہ سب دوست کی طلب ہے جو ہر جگہ سرمار رہی ہے اور بالآخر جب کسی اللہ والے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دوست ہی کا عشق ہے جو عشق اشیاء کی صورت میں سر مار رہا ہے تو پھر اُسے یقین کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور یہ یقین ترقی کرتے کرتے عین الیقین اور حق الیقین تک پہنچ جاتا ہے اور وصالِ حق نصیب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا مقصد بھی یہی ہے کہ دوست کی نشاندہی کی جائے تاکہ اس کے طالب وہاں تک رسائی حاصل کر کے حیاتِ ابدی، سرورِ سرمدی اور دولتِ ابدی سے مالا مال ہوں۔ یقین جانو کہ اس وقت جس چیز کی آپ کے دل میں محبت ہے وہ محبوبِ حقیقی کی محبت ہے ؎

هر چه شد از تابِ زُلفِ یار شد دام شد زنجیر شد تسبیح شد زنار شد
مقصدِ من در ہر دو عالم روئے تست شغل ہائے بے عدد را من بہانہ ساختم (واحدؔ)

لہٰذا جو شخص دوست کی ہستی کا ثبوت طلب کرتا ہے دل سے نہیں دماغ سے طلب کرتا ہے عشق سے نہیں عقل سے طلب کرتا ہے اس لئے بہترین روش یہ ہے کہ دل کی بات سنو عقل کی بات نہ مانو۔

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ — اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

ہست در سینۂ ما جلوۂ جانانۂ ما
بت پرستیم و دلِ ماست صنم خانۂ ما (بو علی قلندر)

حقیقتِ باری تعالےٰ

اللہ تعالیٰ کے ہونے کے متعلق چار قسم کے ہیں اور قطعی ثبوت دیکھ لینے کے بعد اب کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں سے دو ایسے ثبوت ہیں کہ عام طور سے دنیاوی لوگوں نے نہ یہ سُنے ہوں گے نہ دیکھے ہوں گے۔ اب آئیے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی حقیقت کیا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ کو کما حقہٗ سمجھنا بشر کے لئے محال ہے۔ اللہ خالق ہے اور بندہ مخلوق۔ مخلوق کے لئے خالق کو پوری طرح سمجھنا ناممکن ہے۔ انسان کی عقل محدود ہے اور لامحدود کو نہیں سمجھ سکتی۔ اس لئے جو کچھ یہاں باری تعالےٰ کے متعلق بیان ہو گا، وہ وہی ہے جو اس نے خود اپنے کلام پاک میں وحی کے ذریعہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے متعلق بتایا ہے اور جو وجدانی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قربِ حق میں پہنچ کر معلوم ہوا اور جو اولیائے کرام کو کشف کے ذریعے اللہ تعالےٰ نے معلوم کرایا۔

امام غزالیؒ کیمیائے سعادت میں لکھتے ہیں کہ ذاتِ باری کی نیرنگیوں میں حیرت زدہ ہونا اور ششدر رہ جانا انبیاء اور اولیاء کا آخری مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شبِ معراج حقیقتِ عرفان کا غلبہ ہوا اور جبروتِ ہویت جب آپ کے قلب پر غالب ہوا تو آپ نے فرمایا:

لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ (میں تیری صفت اور ثنا نہیں کر سکتا تو ویسا ہے جیسا کہ تو نے اپنی آپ صفت بیان کی ہے)

یاد رہے کہ مختلف مذاہب کا ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق نظریہ یکساں تھا یعنی وہی جو قرآنِ عظیم میں بیان کیا گیا ہے لیکن چونکہ ہزاروں سال گذر جانے کے بعد توحید مخلوط ہوتی گئی اس لئے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئے نبی مبعوث ہوتے رہے تاکہ خالص توحید سے لوگوں کو آشنا کریں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ چونکہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام خدا تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور ساری خلقت کے لئے اور قیامت تک کے لئے ہیں اس لئے آپ کی تعلیمات میں ایسی جامعیت ہے کہ دوسرے انبیاء کرام میں نہ تھی۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

بہرحال اس وقت جو ذاتِ باری کے متعلق مختلف نظریات دنیا میں موجود ہیں ان کی تفصیل تو مشکل ہے۔ مختصر یہ کہ بعض لوگ خالق کو کائنات کے اندر مانتے ہیں اور اس سے باہر کچھ نہیں مانتے اس نظریہ کا نام تشبیہ یا امیننس (IMMANENCE) ہے بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات میں نہیں ہے بلکہ اس سے باہر اور الگ تھلگ ہے اسے تنزیہہ ، تنزیہہ یا ٹرانسینڈینس TRASCENDENCE کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اوّل الذکر تصور کو پین تھی ازم PANTHEISM بھی کہتے ہیں۔ ایک اور نظریہ ہے جس کا نام پالی تھی ازم POLYTHEISM ہے جس میں ایک سے زیادہ خدا مانے جاتے ہیں۔ پھر نیو پلیٹونزم NEOPLATONISM ہے جو پین تھی ازم کے قریب ہے۔ ایک اور نظریہ بھی رائج الوقت ہے جسے سٹوائک سسٹم STOIC SYSTEM کہتے ہیں یہ بھی پینتھی ازم کی ایک شاخ ہے۔ سب سے زیادہ مقبول نظریہ مونزم MONISM ہے جس میں ایک خدا مانا جاتا ہے۔ یہ نظریہ اگرچہ اسلامی عقائد سے کچھ قریب ہے لیکن اس میں یہ غلطی ہے کہ قدیم اور حادث کو مخلوط کر دیا ہے۔ آج کل ایک اور نظریہ نظر آ رہا ہے جس کا نام پینن تھی ازم ہے PANENTHEISM ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سب چیز خدا نہیں بلکہ ہر چیز خدا میں ہے۔

ایرانی نظریہ ایران کے آتش پرست دو خدا مانتے ہیں ایک نیکی کا خدا جس کا نام انہوں نے یزدان رکھا ہے دوسرا بدی کا جو اہرمن کہلاتا ہے۔

ہندو نظریہ ہندو مذہب میں خدا کے ساتھ مادہ اور روح کو بھی قدیم کہا گیا ہے۔ اس مذہب کا عقیدہ پالی تھی ازم POLYTEISM ہے جس میں سینکڑوں خدا مانے جاتے ہیں اور ہر خدا کے لئے علیحدہ بت ہے جس کی پرستش کی جاتی ہے۔ ہندو مذہب میں دنیا فانی نہیں ہے بلکہ ہمیشہ رہنے والی ہے جو چکر کاٹ کاٹ کر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کو تناسخ یا آواگون کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

عیسائی نظریہ عیسائی مذہب میں تین خدا مانے جاتے ہیں۔ ایک خود خدا دوسرا عیسیٰ مسیح تیسری مریم۔ یہ نظریہ تثلیث TRINITY کہلاتا ہے۔

بدھ نظریہ بدھ مذہب کا اچھی طرح پتہ نہیں چلتا کہ کیا چیز ہے بعض یورپین مصنفین کا خیال یہ ہے کہ مہاتما بدھ کوئی پیغمبر یا مذہبی پیشوا نہیں تھے بلکہ ایک راجہ یا راجہ کے بیٹے تھے جنہوں نے سکونِ قلب (شانتی) کی خاطر دنیا ترک کردی تھی۔

یونانی نظریہ یونان کے فلاسفر بھی تین خداؤں کے قائل ہیں۔ خدا۔ عقل۔ نفس

اسلامی عقائد قرآن عظیم اور احادیثِ نبوی میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک اور تمام غلط اور گمراہ کن نظریات سے بلند اور بالاتر ہے۔ اگرچہ دوسرے مذاہب اور فلاسفروں کے بعض نظریات کی کوئی نہ کوئی جھلک اسلامی تصورِ ذات میں دکھائی دیتی ہے لیکن اُن کے نظریات کی جو غلط باتیں تھیں قرآن میں ان کی تردید کی گئی ہے۔ اسلام میں توحیدِ باری تعالےٰ میں سب سے زیادہ واضح اور بین آیات وہ ہیں جو سورۂ اخلاص میں بیان کی گئی ہیں:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ

كُفُوًا اَحَدٌ (کہہ دو اللہ احد ہے وہ صمد ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا ہے نہ اُس کو کسی نے جنا ہے۔ نہ اُس کی کوئی مثال ہے) لفظ احد بہت اہم ہے۔ احد اور واحد میں فرق ہے۔ واحد کہتے ہیں ایک کو اور احد کے معنی ہیں اکیلا " ALONE OR SINGLE اس سے تثلیث کی بھی تردید ہو گئی اور ہندو دھرم کے اس عقیدے کی بھی تردید ہو گئی جس میں خدا کے ساتھ روح اور مادہ کو قدیم کہا گیا ہے کیونکہ وہ احد ہے واحد کے مقابلے میں دو اور تین آسکتے تھے۔ "احدؔ" کہہ کر دوسرے اور تیسرے کی نفی کر دی۔ اللہ تعالیٰ ازلی ہیں یعنی ہمیشہ سے ہیں اور ابدی ہیں یعنی ہمیشہ رہیں گے۔ وہ قدیم ہے یعنی غیر فانی ہے اور اس کے سوا سب کچھ حادث یعنی فانی ہے۔ کل شئیٍ ھالِكٌ الا وجهه (سب چیزیں فنا ہو جائیں گی بجز اس کی ذات کے)

توحید کے اقسام

امام غزالیؒ اپنی کتاب "طب جسمانی و طب روحانی" میں لکھتے ہیں کہ توحید دو قسم کی ہے ایک عوام کی توحید دوسری خواص کی توحید۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عوام کے لئے الگ عقائد ہیں اور خواص کے لئے الگ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا کماحقہٗ سمجھنا چونکہ بشر کی حدِ امکان سے باہر ہے اس لئے بعض لوگ جن کو اللہ تعالےٰ نے ذہنی۔ قلبی اور روحی استعداد اوروں سے زیادہ عطا کی ہے وہ عوام سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ عوام کی توحید کے متعلق امام غزالیؒ نے یہ لکھا ہے:

" ذات کو تم اس طرح مانو کہ نہ وہ مرکب ہے نہ مؤلف۔ نہ متحیز (یعنی جگہ کی محتاج) نہ متغیر (تغیر پذیر) ہے نہ قابل ابعاد (جسمانیت جو طول عرض اور عمق چاہے) نہ محل اعراض ہے یعنی وہ جسم جس کے اندر عرض حلول کرے۔ نہ جسمیت ہے نہ جوہر ہے نہ عرض ہے۔ مکان سے منزّہ ہے اور زمان سے بلند ہے۔ حدوث (فنا ہونا) سے بالا ہے۔ وہ واحد ہے بلا ظل۔ نہ اس کا کوئی نظیر ہے نہ شریک۔ نہ اس کے کوئی برابر ہے۔ نہ اس کے کوئی مشابہ ہے۔ نہ حواس اس کا ادراک کر سکتے ہیں۔ نہ قیاس کی

وہاں تک رسائی ہے۔ یہ ظاہری توحید ہے۔"

باطنی توحید یا خواص کی توحید

امام موصوف لکھتے ہیں کہ

"باقی رہی باطنی توحید یعنی توحیدِ خواص۔ اس کی بحث زیادہ طویل نہیں۔ اس کا مختصر یہ ہے کہ مَنْ عَرَفَ اللہَ کُلَّ لِسَانُہٗ (جس نے اللہ کو پہچانا اس کی زبان گونگی ہو گئی۔ یعنی وہ اس توحید کو بیان نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ مرتبہ مشاہدہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور مشاہدہ کی بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو مشاہدہ ہی سے سمجھ میں آتی ہیں نہ کہنے والا ان کو کہہ سکتا ہے اور نہ سننے والا ان کو سمجھ سکتا ہے۔"

آگے چل کر امام موصوف لکھتے ہیں کہ

"معرفت الٰہی سے یہی مراد ہے کہ جن لوگوں نے اس کو پہچانا ہے۔ اُن کی جبلت میں اس کی معرفت مرکوز ہے ورنہ اس کی ہویت خاصہ کی معرفت ممکن نہیں سب خاص وعام اس میں حیران ہیں۔ طالبوں کی عقل اس کی تلاش میں گم ہو گئی ہے ..... خواص کی توحید لا الٰہ الا اللہ سے بھی اعلیٰ ہے کیونکہ ہویت انانیت الذات ہے۔ بس اس سے زیادہ ممکن نہیں نہ کلام میں طاقت ہے کہ اس کو ظاہر کرے۔ وہ فقط ھُوْ ہے جو کل اشارات اور استعارات سے بعید ہے۔ عارف جب اس کی طرف اشارہ کرے گا تو محض ھُوْ کہے گا۔"

اس مرتبہ ذات کو لاتعین بھی کہا جاتا ہے جو منقطع الاشارہ، منقطع السمت، منقطع النعت (ناقابلِ بیان)، منقطع اللغت ہے کان اللہُ ولم یکن لہ شیءٌ اسی ذات کا تعین کو ظاہر کرتی ہے آلاٰن کما کان سے بھی وہی ذاتِ بحت اور ذاتِ خالص PURE ESSENCE مراد ہے۔ آگے چل کر امام موصوف لکھتے ہیں کہ "اسم اللہ الھیت

کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر ہویت بجز ہویت کے کسی اسم سے ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لئے ہوّیت کا درجہ الہیّت سے بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ الہیّت میں صفات کا اشارہ ہے یعنی ھویت میں ذات کا اشارہ ہے"۔

امام غزالیؒ آگے چل کر فرماتے ہیں،

"پس اے طالب تجھ کو معلوم ہو کر حقیقت کے بیان کرنے سے زبانیں عاجز ہیں۔ اس کی ہویت کے ادراک سے عقل قاصر ہے"۔

امام غزالی لکھتے ہیں امیر المومنین امام المتقین سیدنا و مولانا حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہٗ فرماتے ہیں:

"جس نے کہا فی اللہ یعنی خدا کے اندر، اس نے بے شک خدا کا وصف بیان کیا۔ اس نے شرک کیا۔ اور جس نے کہا فی ما اللہ یعنی اللہ کس چیز میں ہے اس نے اس کو محدود کیا اور جس نے کہا علیٰ ما اللہ یعنی اللہ کس چیز پر ہے اس نے خدا کو محدود کیا اور جس نے خدا کو محدود کیا اس نے خدا کے ساتھ کفر کیا"۔ پس توحید کی یہ انتہائے نظر ہے۔ اس سے آگے کوئی مقام نہیں۔

ایک حدیث نبویؐ میں آیۂ پاک ھوالاول والاٰخر والظاھر والباطن (وہی اوّل ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے) کی تفسیر یوں بیان کی گئی ہے ھوالاوّلَ ولا قَبْلَکَ شیٌٔ ھوالاٰخر ولا بَعْدَکَ شیٌٔ ھوالظاھر ولا فوقَکَ شیٌٔ ھوالباطن ولا دونکَ شیٌٔ (وہ اول ہے اور کوئی چیز اس سے پہلے نہ تھی۔ وہ آخر ہے اور کوئی چیز اس کے بعد نہ ہوگی وہ ظاہر ہے اور کوئی چیز اس سے اوپر نہیں وہ باطن ہے اور کوئی چیز اس کے سوا نہیں"۔

امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ:

"ذات کی معرفت ذات سے زیادہ کسی کو نہیں۔ وہ خود ہی اپنی ہُویت کو خود جانتا ہے۔ وہی اپنا عارف ہے اور وہی معروف، وہی معرفت ہے۔ وہی

وہی علم ہے۔ وہی عالم ہے وہی معلوم ہے۔ وہی اپنی ذات کا عاشق ہے وہی معشوق ہے اور وہی عشق ہے ؎

فلو جهها من وجهها قمرٌ
ولعينها من عينها كحلٌ

(وہ اپنے چہرے کے لئے آپ ہی چاند ہے اور اپنی آنکھوں کے لئے آپ ہی اپنا سُرمہ ہے)
اور عرفان میں جو لذت ہم نے پائی ہے اس کے آگے دنیاوی لذتوں کی کچھ حقیقت نہیں اور نہ ہم اس عرفانی لذت کو بیان کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔جب یہ لذت حاصل ہوتی ہے تو زبان گونگی ہو جاتی ہے اور نظر دیکھنے سے قاصر رہتی ہے۔"

صفاتِ باری تعالیٰ

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں : هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔
(وہی اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے۔ پاک ہے۔ سلام ہے مومن ہے۔ مہیمن ہے۔ عزیز ہے۔ جبار ہے۔ متکبّر ہے۔ خالق ہے۔ باری ہے مصوّر ہے اور کل اچھے نام اس کے ہیں)

بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات کے قائل نہیں ان میں فلاسفۂ یونان شامل ہیں۔ یونان کے فلاسفر اللہ کی صرف ایک صفت مانتے ہیں یعنی علم۔ باقی کچھ نہیں مانتے لیکن اسلام میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات بیان کی گئی ہیں بلکہ یہ ساری کائنات اس کی مختلف صفات کا ظہور ہے۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ کی اتنی صفات ہیں جتنی اس عالم میں اشیاء ہیں لیکن مختصر طور پر قرآن میں اللہ تعالےٰ کے ننانوے نام مذکور ہیں۔ ان صفات کا نچوڑ سات صفات ہیں جن کو اسمائے اُمہات کہا جاتا ہے یعنی علم۔ ارادہ، قدرت۔ کلام۔ سمع۔ بصر حیات۔ ان اسماء وصفات کی تفصیل اسلامی کتابوں میں موجود ہے۔ امام غزالی نے بھی اسمائے

الٰہی کی تشریح میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "اسماء الٰہی" ہے۔ یہ کتاب دیکھنے کے قابل ہے۔ ایک بزرگ نے تو قرآن مجید کی مختلف آیات میں سے اللہ تعالیٰ کے ڈیڑھ ہزار نام نکالے ہیں۔ کسی شاعر نے اسماء و صفات کو یوں بیان کیا ہے ؎

بنامِ آں کہ او نامے ندارد
بہر نامیکہ خوانی سر برآرد

(میں شروع کرتا ہوں اس کے نام سے جس کا کوئی نام ہی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس نام سے پکارو جواب دیتا ہے)

اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق

اللہ تعالیٰ کے جملہ صفات میں سے صفتِ تخلیق کو اس وقت ہم لیتے ہیں کیونکہ ہر زمانے میں سب سے زیادہ بحث اسی مسئلہ خالق و مخلوق پر ہوتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جا بجا قرآن عظیم میں فرمایا کہ ہر چیز کا خالق وہی ہے نیز ہر چیز فانی ہے اور صرف اس کی ذات باقی رہنے والی ہے۔

جن بزرگ ہستیوں پر کشف کے ذریعہ سے کائنات کی تخلیق کے متعلق راز و رموز ظاہر ہوئے۔ اُن کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور پیدا فرمایا۔ اس کے متعلق حدیثِ نبوی یوں ناطق ہے - اول ما خلق اللہ نوری (سب سے پہلے جو کچھ اللہ نے پیدا کیا وہ میرا نور ہے) اس پہلی تخلیق کو تعینِ اوّل اور حقیقتِ محمدیہؐ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اِسے وجودِ منبسط کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس حقیقت کا انکشاف دوسری امتوں کو بھی ہوا ہے جسے وہ لوگوس LOGOS کے نام سے موسوم کرتے ہیں حقیقۃ الحقائق سے بھی یہی مراد ہے۔ حقیقت محمدیہؐ مثل اس نقشہ کے ہے جو عمارت تعمیر کرنے سے پہلے معمار یا مالک مکان یا انجنیئر پہلے اپنے دماغ میں اور پھر کاغذ بناتا ہے لہٰذا حقیقتِ محمدیہ ساری کائنات کا نقشہ ہے اور ساری کائنات آپ کے نُور سے ظہور پذیر ہوئی۔
حقیقت محمدیہ کا دوسرا نام وحدت ہے جو پہلا تعین ہے۔ اس سے قبل ذات لاتعین تھی۔

تنزّلات اس علم کو تنزلات DEVOLUTION کہتے ہیں۔ تنزلات سے مراد وہ منازل یا وہ سیڑھیاں ہیں جن پر سے ذات نے نزول فرمایا اور کائنات وجود میں آئی۔ ان کو کبھی تعینات۔ کبھی تجلیات۔ کبھی تقیدات اور کبھی اعتبارات کہتے ہیں۔ ذیل کے نقشہ سے ترتیب موجودات کا ایک خاکہ ذہن میں آسانی سے آسکے گا۔

اس شکل میں سب سے بڑا دائرہ تعین اول یعنی حقیقتِ محمدی LOGOS ہے۔ اس دائرہ سے باہر یا اوپر ذاتِ بحت ہے جسے لا تعین کہتے ہیں۔ دوسرا دائرہ حقیقتِ انسان یا تعینِ ثانی ہے جس میں کائنات کا اجمال ہے اس لئے اُسے کائناتِ صغیر MICROCOSM کہتے ہیں۔
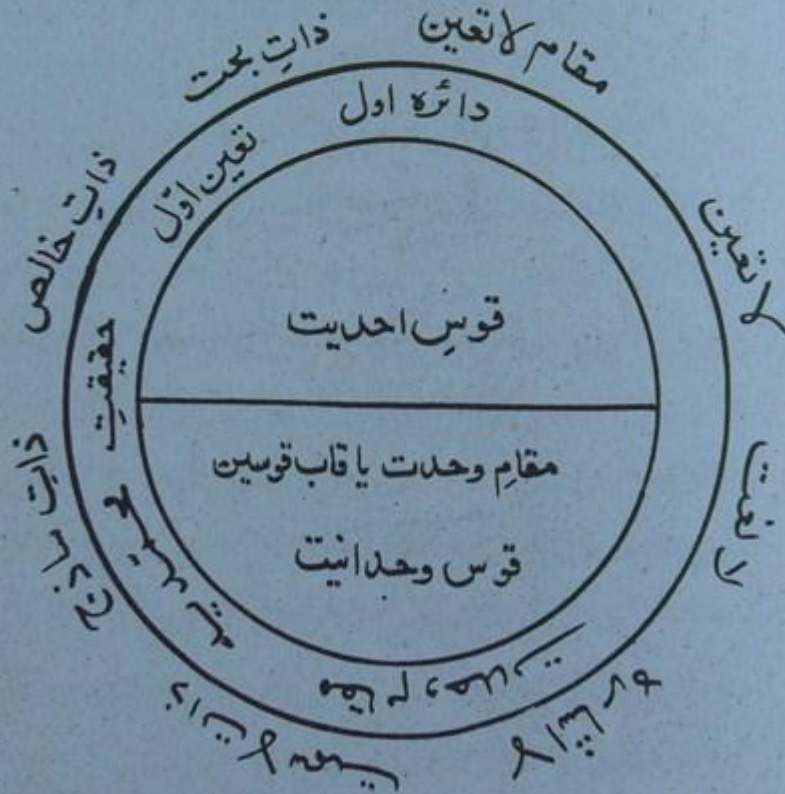
قابِ قوسین وہ مقام ہے جہاں احدیت واحدیت کی قوسیں آپس میں ملتی ہیں۔ یہ غایت ہے

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج وشہود وجدان کی قبل فنا فی اللہ کے۔ اَو ادنیٰ سے مراد مقام فنا فی اللہ اور بقا باللہ ہے۔ دیگر انبیاء علیہم السلام کا مقام قاب قوسین تھا لیکن آپؐ کا مقام اَو اَدنیٰ ہے جس سے مراد فنا فی اللہ اور بقا باللہ ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سرِ دلبراں مصنفہ حضرت مولانا سید محمد ذوقی شاہ صاحب قدس سرہٗ۔

اللہ تعالےٰ کہاں ہیں

بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہیں۔ اس کا جواب علمائے ظاہر کے امام ابن تیمیہؒ نے آیۂ مبارک الرحمٰنُ عَلَی العَرْشِ استویٰ (اللہ تعالےٰ اپنی رحمان کی صفت سے عرش پر مقیم ہے) سے یوں نکالا ہے کہ اللہ تعالےٰ اوپر کی جانب عرش پر مقیم ہیں۔ لیکن یہ جواب صحیح نہیں ہے اور قرآن عظیم حدیث نبوی اور اولیاء کرام کے مشاہدات سے جو حقیقت واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا وجود ہر جگہ ہے۔ وہ ہر جگہ ہے لیکن کسی خاص جگہ میں نہیں، وہ سمت سے پاک ہے۔ زمان ومکان سے پاک ہے۔ شکل وصورت سے پاک ہے۔ قرآن مجید میں جو اللہ کے ہاتھ اور آنکھیں بیان کی گئی ہیں ان سے اس کے صفات کی طرف اشارہ ہے لیکن امام ابن تیمیہ کے نظریۂ استویٰ علی العرش سے اللہ تعالےٰ کا جسم لازم آتا ہے اس لئے اکثر ارباب معرفت نے لکھا ہے کہ امام ابنِ تیمیہ تجسیم کے قائل تھے۔ امام موصوف کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے علم سے ہر جگہ موجود ہے لیکن وجود سے ہر جگہ موجود نہیں بلکہ اوپر عرش پر مقیم ہیں۔ اس سے اللہ کی ہستی محدود ہو جاتی ہے کیونکہ عرش پر مقیم تسلیم کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ باقی کسی جگہ نہیں ہے اِس لئے محدود ہو گیا اور جمہور علماء کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو محدود قرار دینا کفر کا کام ہے۔

سائنس، علم نجوم، جغرافیہ اور روزمرہ مشاہدہ کی رُو سے امام ابنِ تیمیہ کا عقیدہ صحیح نہیں

سائنس، علم نجوم اور روزمرہ مشاہدہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ زمین گول ہے۔ زمین فضا میں معلق ہے اور دو چکر لگا رہی ہے ایک چکر وہ اپنے محور کے گرد کرتی ہے جس سے دن رات

پیدا ہوتے ہیں اور دوسرا چکر وہ سورج کے گرد لگاتی ہے جس سے موسم وجود میں آتے ہیں۔ پہلا چکر چوبیس گھنٹے میں طے ہوتا ہے اور دوسرا ایک سال میں۔ زمین کے گول ہونے کے ثبوت بہت ہیں اور پرائمری و مڈل کلاس کے طالب علموں کو خوب یاد ہیں۔ ایک ثبوت یہ ہے کہ جب آپ بحری جہاز یا ہوائی جہاز کے ذریعہ زمین کے گرد چکر لگانے کی خاطر کراچی سے مغرب کی جانب روانہ ہوتے ہیں اور عرب۔ مصر۔ یورپ سے ہوتے ہوئے بحرِ اوقیانوس طے کر کے امریکہ پہنچ جاتے ہیں اور پھر سرزمین امریکہ پر اُسی مغرب کی جانب ریل یا موٹر گاڑی میں سفر جاری رکھتے ہیں تو امریکہ کے مغربی ساحل پر پہنچ کر بحرالکاہل میں داخل ہو جاتے ہیں اور بحرالکاہل میں اُسی مغرب کی جانب سفر جاری رکھتے ہوئے آپ آسٹریلیا۔ نیوزی لینڈ سے ہوتے ہوئے جاپان پہنچ جاتے ہیں اور پھر انڈونیشیا اور ملایا سے ہوتے ہوئے برما۔ تھائی لینڈ اور ہندوستان پہنچ کر مشرق کی جانب کراچی پہنچ جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ آپ گئے تو مغرب کی طرف تھے لیکن واپس مشرق کی جانب سے آ گئے۔ یہ کوئی غیر معمولی اور نئی بات نہیں ہر سال ہزاروں لوگ اسی طرح سفر کرتے ہیں اور کرۂ ارض کے گرد چکر لگا کر واپس آجاتے ہیں۔ کرۂ ارض کے مجسّم نقشے یعنی گلوب پر نظر ڈالیں تو براعظم ایشیا براعظم امریکہ کی بالکل مخالف سمت میں کرۂ ارض پر واقع ہے اس لئے ایشیا والوں کے لئے جو اوپر کی سمت ہوگی وہ امریکہ والوں کے لئے نیچے کی سمت ہوگی اور جو امریکہ والوں کے لئے اوپر کی سمت ہے وہ ایشیا والوں کے لئے نیچے کی سمت ہے۔ اس لے اگر آپ ایشیا میں بیٹھ کر یہ کہیں کہ خدا تعالےٰ اوپر کی طرف عرش پہ مقیم ہے تو امریکہ والوں کے لئے وہ نیچے کی طرف ہوگی اور امریکہ میں بیٹھ کر آپ کہیں کہ اللہ تعالےٰ اُوپر کی جانب عرش پہ مقیم ہے تو وہ ایشیا والوں کے لئے نیچے کی سمت ہوگی اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ کے لئے اوپر کی سمت مقرر نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ حق یہ کہتے ہیں کہ اللہ سمت، اشارہ۔ مکان اور زمان سے پاک اور بالاتر ہیں۔

امام ابنِ تیمیہ نے کیوں یہ عقیدہ قائم کیا

قرآن و حدیث میں کسی جگہ اللہ تعالےٰ

کے لئے کوئی سمت یا زمان و مکان کی قید نہیں لگائی گئی۔ صرف ایک حدیث سے یہ پایا جاتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے لئے اوپر کی جانب اشارہ فرمایا۔ اگر آپ کا مطلب یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اوپر کی جانب ہیں تو یہ بات علوم و فنون اور روزانہ تجربہ کے خلاف ہوتی لیکن پیغمبر علیہ السلام کی کوئی بات سائنس اور علوم و فنون کے خلاف نہیں ہے بشرطیکہ وہ علوم و فنون غلط نہ ثابت ہو چکے ہوں لیکن زمین کا گول ہونا اور ہوا میں معلق ہونا تو اب پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے ذاتی تجربہ میں آچکا ہے اس لئے اسے غلط نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس لئے جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر کی جانب اشارہ فرمایا تو اس کا مطلب اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور بلندیٔ مرتبہ کا ظاہر کرنا تھا۔

امام ابن تیمیہ نے یہ حدیث اس لئے اپنے استدلال کے لئے چُن لی کہ آپ کو کسی اور مطلب کے لئے اللہ تعالیٰ کو کائنات سے خارج کرکے اوپر کی جانب عرش پر بٹھانا مقصود تھا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ جو صوفیائے کرام وحدت الوجود کا دعویٰ کرتے ہیں امام صاحب کے خیال میں اس سے حلول INCARNATION لازم آتا ہے اور چونکہ حلول شریعت کے خلاف ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کائنات سے الگ تھلگ دکھایا جائے تاکہ مسئلہ وحدت الوجود کو غلط ثابت کرکے حلول کی بندش کی جائے لیکن امام موصوف نے یہ خیال نہ فرمایا کہ ایک غلطی سے دس اور غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی یا وجود کو کائنات سے خارج کرکے الگ تھلگ اور عرش پر مکین دکھایا جائے تو اس سے وہ محدود ہو جاتا ہے اور کیونکہ جب اُسے ایک جگہ سے خارج اور دوسری جگہ پر مقیم کر دیا جائے لازماً وہ محدود ہو گیا۔ جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہاں نہیں ہے وہاں ہے، یہ محدود کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو ہر جگہ غیر محدود لامحدود، لاانتہا اور بے پایاں بتایا گیا ہے۔ اس لئے امام موصوف استویٰ علی العرش کا عقیدہ جو انھوں نے وحدت الوجود اور حلول کو رد کرنے کے لئے قائم کیا تھا قرآن و حدیث

کی رُو سے غلط نکلا۔ اور جمہور علماء کا یہی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لامحدود ہے۔

وحدت الوجود سے حلول لازم نہیں آتا اگر امام موصوف ٹھنڈے دل سے غور کرتے اور ابن عربی نے جو اُن کے ہم زبان تھے اپنے عقیدۂ وحدت الوجود کو جو تصریحات اور تشریحات اپنی کتاب "فتوحاتِ مکیہ" میں کی ہیں اُن کا امام صاحب مطالعہ کرتے تو واضح ہو جاتا کہ وحدت الوجود کی حقیقت کیا ہے اور یہ کہ اس سے حلول لازم نہیں آتا۔ شیخ اکبر نے کئی مقامات پر فتوحاتِ مکیہ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وحدت الوجود سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ہر چیز خدا ہے اُن کے اپنے الفاظ یہ ہیں جو امام ابنِ تیمیہ کی نظروں سے بھی گزر چکے ہیں ؎

اَلْعَبْدُ عَبْدٌ وَ اِنْ تَعَرَّجَ
وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ

(بندہ بندہ ہے خواہ وہ کتنا عروج کرے اور رب رب ہے خواہ وہ کتنا نزول فرمائے) عروج ونزول کے سفر کا ذکر تو مفصل آگے آرہا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا کافی ہے کہ وحدت الوجود سے ابنِ عربی کا مطلب یہ نہیں کہ ہر چیز خدا ہے کیونکہ یہ شرک ہے بلکہ ان کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ کائنات حق تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کا ظہور ہے اِس لئے یہ کوئی علٰحدہ چیز نہیں ہے کیونکہ صفت اور موصوف ایک ہیں۔ جس طرح ایک شاعر کا کلام یا ایک مصنف کی کتاب اس کی صفتِ شاعری اور صفتِ تصنیف کا مظہر ہے اسی طرح کائنات بھی حق تعالیٰ کی صفتِ خلق کا مظہر ہے۔ اگر آپ صفت اور موصوف کو ایک سمجھیں تو کائنات کو ذاتِ حق کا عین کہا جا سکتا ہے اگر صفت و موصوف کو ایک نہ سمجھیں تو کائنات حق تعالیٰ کی غیر ہے عین نہیں۔ بس وحدت الوجود سے صرف یہی مراد ہے۔ یہ نقطہ نگاہ یا اعتبار کا فرق ہے حقیقت میں اس مسئلہ میں کوئی اُلجھن نہیں ہے۔ خود صوفیاء کرام بھی عینیت اور غیریت دونوں کے قائل ہیں۔ ان کا قول ہے کہ کائنات عین بھی ہے اور غیر بھی ہے اور عین بھی نہیں اور غیر بھی نہیں۔ صوفیاء کرام اکثر شیشہ اور عکس کی مثال دیتے

ہیں۔ شیشے میں عکس ایک لحاظ سے عین ہے اور ایک لحاظ سے غیر۔ بس یہی حال خالق و مخلوق کا ہے اس میں کوئی دشواری نہیں۔ اُلجھن صرف منطقی دلائل کی موشگافیوں کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے یا یوں کہو کہ عینیت اور غیریت نزاع لفظی کے سوا کچھ نہیں۔

ابن عربی بھی امام ابن تیمیہ اور امام بخاری کی طرح ظاہریہ مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اور شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں اپنے والدین کا بے حد مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے بچپن میں یہ بتا دیا تھا کہ اللہ ایک ہے محمدؐ برحق ہے شریعت واجب التعظیم ہے اور قیامت وحساب وکتاب برحق ہے کیونکہ اس عقیدہ کے بغیر آدمی مسلمان نہیں ہوسکتا اور ہمیشہ اس عقیدہ سے میں راہِ راست پر رہا۔ ابن عربیؒ نے کئی بار فتوحات مکیہ میں لکھا ہے کہ شریعت لازمی ہے۔ اگر کوئی شخص ہوا میں اُڑتا ہوا آئے لیکن شریعت کا پابند نہیں ہے تو اُسے جھوٹا سمجھو۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ابن عربی کی تکفیر اور تکذیب سے لوگوں کو بچانے کے لئے انھوں نے ابن عربی کی اپنی تشریحات درج کی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں شریعت کے پابند تھے اور ان کا کلام غیر شرعی نہیں ہے۔ کتاب کا نام "تنبیہ الطربی" ہے۔ تفصیل کے خواہشمند اس کی طرف رجوع کرسکتے ہیں۔

اب جب وحدت الوجود کی حقیقت آپ نے سمجھ لی اور یہ بھی دیکھ لیا کہ اس سے حلول لازم نہیں آتا تو پھر وحدت الوجود سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کو سمت اور مکان (عرش) میں مقید کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

وحدت الوجود کی مخالفت کی ایک اور وجہ

اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ کو ایک اور غلط فہمی بھی ہوئی۔ جب حسین ابن منصور حلاج نے نعرۂ اناالحق لگایا اور بایزید بسطامی نے سبحانی ما اعظم شانی (میں پاک ہوں اور میری شان بلند ہے) تو امام صاحب کو خیال ہوا کہ یہ حلول ہے کیونکہ عیسائی مذہب کے لوگوں کا یہی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اتر آئے

تھے۔ اسی طرح ہندوؤں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ رام اور کرشن اللہ تعالیٰ کے اوتار تھے یہ صاف اور صریحی حلول ہے جو کفر ہے۔ لیکن حلاج نے جب انا الحق کہا اور بایزید بسطامی نے جب سبحانی کا نعرہ لگایا تو اس سے حلول مراد نہ تھا بلکہ ہوا یہ تھا کہ ان کو ذاتِ حق میں فنا کا مقام حاصل ہوچکا تھا۔ فنا سے مراد حلول نہیں بلکہ یہ ہے کہ سالک اپنی ہستی کو ذاتِ حق میں گم کردیتا ہے اور محویت اور استغراق کے غلبہ سے مغلوب ہوکر اس کی زبان سے اس قسم کے کلمات نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ جب بایزید بسطامی کو ان کے مریدین بتاتے تھے کہ آپ نے عالم استغراق میں یہ کلمات کہے تو آپ پشیمان ہوتے تھے اس لئے آپ نے اپنے مریدین کو حکم دے دیا تھا کہ اگر میں پھر یہ کلمات کہوں تو مجھے قتل کردینا۔ لیکن جب وہ ان کو قتل کرنا چاہتے تھے تو چھریاں خود ان کی اپنی طرف مڑ جاتی تھیں اور حضرت شیخ کو کوئی گزند نہ پہنچتا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کو خود اس بات کا احساس تھا کہ جو کچھ کہا ہے غلط اور غیر شرع ہے۔

امام ابن تیمیہ کی تحریرات سے ظاہر ہے کہ وہ بھی سُکر اور استغراق کے قائل ہیں اس لئے اگر کسی سے استغراقی کیفیت کے غلبہ میں زبان سے کوئی غیر شرع بات نکل جائے تو قابلِ معافی ہے۔ امام موصوف صوفیاء کرام کے تمام منازل و مقامات مثل فنا فی اللہ، بقا باللہ، سُکر، صحو، استغراق، ہوشیاری اور مستی کے قائل ہیں بلکہ ان دو چار صوفیاء کے علاوہ جن سے کلماتِ شطح سرزد ہوئے باقی سب کی بزرگی اور کمالات کے وہ معترف ہیں۔ ابو نصر المنبجی کی خدمت میں جو انھوں نے خط لکھا اس کا اقتباس ذیل ہے :-

"سالکین میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں جو اپنے سلوک میں اللہ تعالیٰ کی کامل ربوبیت اور قیومیت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسی ربانی توحید میں فنا ہوجاتے ہیں"... نیز لکھتے ہیں " جامع توحید میں بندے کے تین مقام ہیں۔ پہلا مقام فرق و کثرت کا ہے۔ دوسرا مقام جمع و فنا کا

مقام ہے۔ تیسرا مقام جمع میں تفرقہ اور وحدت میں کثرت کے مشاہدہ کرنے کا ہے۔ یہی تیسرا مقام فنار کامل کا مقام ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن بعض مغلوب الحال مشائخ کو فنا، قاصر کی حالت میں سکر پیدا ہوا اور ان کی زبان سے سبحانی ما اعظم شانی جیسے فقرے سرزد ہوئے۔ اس سکر کی بنا پر بعض لوگوں نے عین حلول و اتحاد کا دعویٰ کیا"

امام موصوف کے یہ شبہات لازمی تھے۔ اور ان ہی شبہات کی بنا پر یورپ کے اکثر مصنفین نے حسین ابن منصور حلاجؒ اور بایزید بسطامی کے ان کلمات سے یہی معنی نکالے ہیں کہ وہ حلول کے قائل تھے اور چونکہ حلول عیسائی اور ہندو مذہب کا عقیدہ ہے اس لئے وہ ان مذاہب کے خوشہ چیں تھے اور روحانیت انھوں نے ان مذاہب سے حاصل کی کیونکہ اسلام روحانیت سے خالی تھا۔ یہ غلط فہمی ان کلماتِ سُکر سے پیدا ہوئی۔ غیر تو غیر خود مسلم مشائخ نے بھی ابن عربیؒ کے پیچیدہ کلام سے اپنے مریدین کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس سرہٗ ابن عربی کے ہم عصر تھے۔ آپ کے اصحاب و مریدین نے جب حضرت شیخ سے ابن عربیؒ کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "ھٰذَا رَجُلٌ زِنْدِیْقٌ (یہ مرد کافر ہے) کچھ عرصے کے بعد جب ابنِ عربی کا وصال ہوا تو حضرت شیخ نے نعرہ مارا اور فرمایا کہ آہ آج زمانے کا قطب چل بسا۔ اس پر آپ کے اصحاب نے عرض کیا کہ حضور اگر آپ پہلے زندیق نہ کہتے تو ہم بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ آپ نے فرمایا کہ اسی لئے تو میں نے اُن کو زندیق کہا تاکہ تم لوگ ان کے پاس نہ جاؤ کیونکہ ان کا کلام بہت اونچا اور پیچیدہ ہے تم فتنہ میں گرفتار ہو جاتے۔ آپ جانتے ہیں کہ حضرت شیخ شہاب الدین کے اصحاب کون تھے حضرت غوث بہار الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ، شیخ سعدی شیرازیؒ اور مخدوم جلال الدین بخاری اوچیؒ۔ جب ان اکابر اولیار کو حضرت شیخ نے اس قسم کے کلمات سُننے کی اجازت نہ دی تو عوام الناس کا کیا حال ہوگا۔

قرونِ اولیٰ کے مشائخ وحدت الوجود بیان کرنے میں کیوں خاموش رہے

یہی وجہ ہے کہ قرونِ اولیٰ کے اولیاء و مشائخ اپنے بلند مقامات کے با وجود وحدت الوجود جیسے اسرار و رموز کے مسائل بیان کرنے میں سخت احتیاط کا پہلو برتتے رہے لیکن جب سے اور خاص طور پر آج کل کے زمانے میں یہ باتیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ایسے ڈبہ پیر اور گندم نما جو فروش پیدا ہو گئے ہیں کہ شریعت سے بالکل غافل ہیں نماز روزہ سے عاری ہیں۔ بھنگ اور شراب ان کا شعار ہے۔ وحدت الوجود اور ہمہ اوست کی آڑ میں بدترین جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اُن سے اگر کوئی یہ کہے آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے تو بس یہی کہتے ہیں کہ نماز کس کی پڑھی جائے، جب غیر کا وجود ہی نہیں تو نماز کس کی اور کہاں کا روزہ۔ جب اُن سے جرائم کی بابت پوچھا جاتا ہے تو یہ فرماتے ہیں کہ کیا دریا بھی ناپاکی گرنے سے یا کتے کے پانی پینے سے ناپاک ہو سکتا ہے ہم تو دریا ہیں۔ ان مولویانہ باتوں کی ہم پرواہ نہیں کرتے۔ مولوی لوگ کیا جانیں کہ قرآن کیا ہے اور اسلام کیا ہے۔ شریعت اور چیز ہے اور فقیری اور شے ہے۔ یہ ہیں وہ خرافات جو ان جاہل صوفیوں اور داڑھی منڈے تارکین صوم وصلوٰۃ سجادہ نشینوں کی زبان سے بھی اکثر سننے میں آتے ہیں ان میں سے بیشتر سنگین جرائم میں بھی مبتلا ہوتے ہیں لیکن بیعت بھی کرتے رہتے ہیں اور خلفا بھی بناتے رہتے ہیں۔ ایں چہ بوالعجبی است۔

خلاصۂ بحث

اوپر کے بیان سے ظاہر ہے امام ابن تیمیہ نے وحدت الوجود کے خوف سے آیۂ مبارک "الرحمٰن علی العرش استویٰ" سے وہ مطلب نکالا جو علم نجوم سائنس جغرافیہ اور روز مرّہ کے تجربہ کے خلاف ہے۔ اب آئیے ہم یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کا یہ عقیدہ قرآن وحدیث کی رو سے بھی صحیح نہیں ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اوپر کی جانب عرش پر مقیم ہے ہر جگہ موجود نہیں بلکہ اس کا علم ہر جگہ موجود ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ ہر جگہ موجود ہے۔

اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجهُ الله (جس طرف منہ کرو اُسی طرف اللہ کا منہ ہے یعنی ذات ہے)

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو)
وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ (اور اللہ وہ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے)
نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (اللہ تعالیٰ انسان کی رگ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہے)
وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (اور اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے)
ایک اور آیت میں ہے کہ جب تم میں سے چار آدمی بیٹھ کر مشورہ کرتے ہیں تو پانچواں اللہ ہوتا ہے اور اگر پانچ آدمی مل بیٹھتے ہوں تو چھٹا اللہ ہوتا ہے - نیز فرمایا وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (اور تم اپنے اندر کیوں نہیں جھانکتے) ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے اور کوئی جگہ اس سے خالی نہیں - نیز جس آیت کی رُو سے اللہ تعالیٰ عرش پر مقیم ہونا ثابت کیا جاتا ہے اس پر بھی غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کا ہر جگہ موجود ہونا ثابت ہوتا ہے - عرش و کرسی کی وضاحت خود قرآن سے سُنئے - آیۃ الکرسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (اس کی کرسی میں آسمان اور زمین شامل ہیں) جب عرش اور کرسی جس پر حق تعالیٰ مقیم ہیں تمام کائنات پر مشتمل ہے تو پھر تو اللہ تعالیٰ کا ہر جگہ موجود ہونا اسی استوٰی عرش والی آیت سے ثابت ہو گیا - امام غزالی سورۂ نور کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ نور السموات والارض میں نور سے مراد نورِ حیات اور نورِ جاں ہے - اس کا یہ مطلب ہوا کہ حق تعالےٰ جانِ جہان اور روح کائنات ہیں - پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (یعنی نورِ جان ہے) اس نور کی مثال اُس قندیل کی ہے جو طاق میں رکھی ہو - اور قندیل میں ایک شیشہ ہے جس کے اندر وہ نور ہے نہ شرقی ہے نہ غربی اور وہ بغیر تیل کے روشن ہے - طاق سے مراد انسانی جسم ہے - قندیل سے مراد قلب اور شیشہ سے مراد روح ہے جو "فَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ" کا کرشمہ ہے -

اب حدیث کی طرف آئیں - آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (یہ حدیث قدسی ہے) کہ لَا یَسَعُنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ وَلٰكِنْ یَسَعُنِیْ قَلْبُ

عَبْدِی المومن (یعنی نہ اپنی زمین میں سما سکتا ہوں نہ اپنے آسمان میں لیکن اپنے بندۂ مومن کے قلب میں سما سکتا ہوں۔ بخاری شریف کی ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالٰے فرماتے ہیں کہ جب میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اس سے قریب ہو جاتا ہوں اور اس قدر قریب ہو جاتا ہوں کہ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے دیکھتا ہے، اس کے کان بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے سُنتا ہے، میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے پکڑتا ہے اور اس کے قدم بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے چلتا ہے۔ نحن اقرب کی قرآنی آیت اور اس حدیث پاک سے قرب کی جو منزل بتائی گئی ہے اس سے زیادہ قرب وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ ان آیات اور احادیث کی بنا پر علمائے اسلام اور ائمۂ مجتہدین کا یہی مذہب رہا ہے کہ اللہ تعالٰی اپنی ذات و صفات سے لامحدود ہے اور ہر جگہ موجود ہے اور مجاہدات اور تزکیۂ نفس کے ذریعے انسان قرب کی بلند ترین منازل یعنی فنا فی اللہ اور بقا باللہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے متعلق مفصل بحث بعد میں آئے گی۔

عقیدۂ بہشت و دوزخ اسلام میں دوزخ و بہشت کا عقیدہ بھی برحق ہے۔ اللہ تعالٰی بادشاہ کل اور احکم الحاکمین ہے۔ اس نے دوزخ اس لئے پیدا کی ہے کہ بد اعمال کی سزا دے اور بہشت اس لئے پیدا کی ہے اچھے اعمال کا انعام عطا کرے۔

قضا و قدر قضا و قدر پر بھی ایمان لانا فرض ہے۔ یہ مسئلہ بھی مسئلہ وحدت الوجود کی طرح بے حد پیچیدہ ہے اور اسی وجہ سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بحث کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ عوام الناس کی سمجھ سے یہ بالاتر ہے لیکن پھر بھی اس کا جواب موجود ہے۔ اہل سنت وجماعت کا عقیدہ یہ ہے اور یہ قرآن و حدیث پر مبنی ہے کہ ہر نیکی کا کام آدمی اللہ تعالٰے کے حکم سے کرتا ہے اور ہر بُرا کام اپنے نفس کی شرارت سے کرتا ہے۔ بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو

کچھ فرمایا ہے حق فرمایا ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان مجموعہ ہے روح اور جسم کا - روح
عالم بالا کی چیز ہے اور فنفخت من الروحی کے مصداق اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے
اور جسم اس خاکی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور خواہشاتِ نفسانی انسان کو گناہ کی طرف
کھینچتی ہیں لہٰذا جب کثرتِ عبادات و مجاہدات کی وجہ سے تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے
تو روح کی طاقت بڑھ جاتی ہے اور جسمانی اور نفسانی خواہشات پر غالب آجاتا ہے
اس غلبہ سے جو کام اس سے سرزد ہوتا ہے وہ ملکوتی قوت یا قوتِ ربانی سے منسوب
ہونا چاہیئے۔ اس کے برعکس جو کام یعنی گناہ کا کام نفسانی خواہشات کے غلبہ سے ہوتا
ہے وہ نفس کی طرف منسوب ہونا چاہیئے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نیک کام
اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور گناہ کا کام انسان کی اپنی نفسانیت کی وجہ سے سرزد
ہوتا ہے
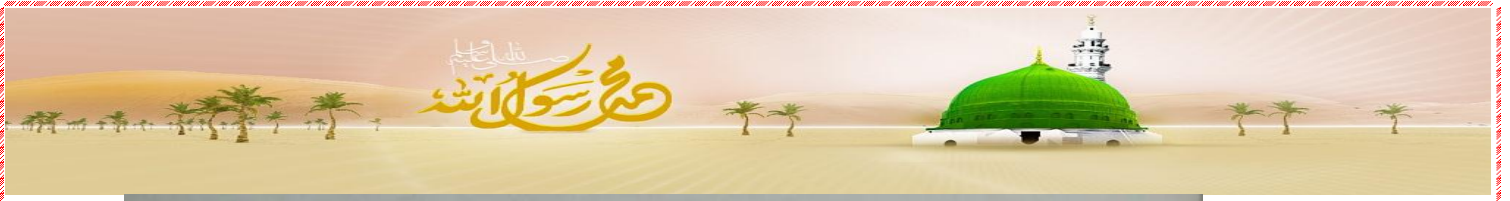
تیسرا باب
حقیقتِ انسان

حیاتِ انسانی کے کئی پہلو ہیں - ایک یہ کہ انسان تعینِ ثانی اور خلاصۂ کائنات ہے۔ تعین اوّل حقیقتِ محمدیہ ہے جسے سابقہ مذاہب کے اکابر اور یونانی فلاسفر لوگوس LOGOS کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہ مقامِ وحدت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے سب سے پہلے حقیقت محمدیؐ کی تخلیق فرمائی اور حقیقت محمدیہ کے نور سے ساری کائنات کو پیدا فرمایا حدیث اوّل ما خلق اللہ نوری کا مطلب یہی ہے جب ساری کائنات اللہ تعالےٰ کے مختلف اسماء و صفات کے پرتو سے وجود میں آگئی تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا اور چونکہ حضرتِ انسان اشرف المخلوقات ہو کر اللہ تعالےٰ کی طرف سے دنیا میں اس کا نائب یا خلیفہ مقرر ہوا اس لئے اللہ تعالےٰ نے اسے کائنات کا خلاصہ بنایا یعنی جو کچھ کائنات میں بطور تفصیل موجود تھا انسان میں بطور اجمال بھر دیا۔ اور بجا طور پر وہ خلیفۃ اللہ VICEGERENT بننے کا مستحق ہوا۔ چونکہ جو کچھ کائنات میں بالتفصیل موجود ہے انسان میں بالاجمال موجود ہے۔ اس حقیقت کو شاعرانہ اور عاشقانہ انداز میں حضرت مولانا رومؒ نے یوں بیان فرمایا ہے ؎

باده از ما مست شد نے ما ازو
قالب از ما هست شد نے ما ازو

(شراب میں مستی کہاں سے آئی ہماری ہی مستی اس کے اندر ہے اور قالب انسانی کہاں سے زندہ ہوا ہم ہی تو تھے جس سے آدم کی مٹی کا خمیر بنایا گیا)

اسی لئے کائنات کو عالمِ کبیر MACROCOSM اور انسان کو عالمِ صغیر MICROCOSM کہا جاتا ہے۔

انسانی زندگی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اربعہ عناصر یعنی آب و آتش۔ باد۔ خاک کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ ان عناصر کی باہمی دشمنی ہے لیکن کمالِ حکمت سے خلاقِ عظیم نے ان متضاد عناصر کو انسان کے اندر یکجا جمع کر کے اُسے دولتِ عقل سے نوازا ہے تاکہ ان سب میں اعتدال پیدا کر سکے اور اس دخانی کشتی (جسم) پر سوار ہو کر منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔

حیاتِ انسانی کا تیسرا اور سب سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ انسان کو روح اور جسم کا مجموعہ بنایا گیا ہے۔ اگرچہ روح کی بھی کئی قسمیں ہیں مثلاً اول روح حیوانی جو انسان سمیت سب جانوروں میں مشترک ہے دوم روح انسانی یا روح ملکوتی اور سوم روح القدس۔ لیکن مجموعی طور پر ان سب کو روح کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ روح عالمِ بالا یا عالمِ قدس کی چیز اور آدمی کو عالمِ قدس کی جانب کشش کرتی۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں فَنَفَخْتُ فِیْهِ من الروحی (میں نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی۔ صیغہ مضارع سے ماضی کے معنی لئے گئے ہیں) جسم عالمِ ناسوت یعنی اس خاکی دنیا کی چیز ہے اور اس کی کشش عالمِ سفلی کی طرف ہے۔ کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِه (ہر چیز کا رجوع اپنی اصلیت کی طرف ہوتا) لہٰذا انسانی زندگی روح اور جسم کے مابین دائمی کشمکش کا نام ہے اور یہی اس کا امتحان ہے لیکن امتحان میں کامیاب ہونے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا فرمائی ہے تاکہ حق و باطل میں تمیز کر سکے۔ نیز عقل کو مدد دینے کی خاطر اللہ تعالےٰ ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام مبعوث فرماتے رہے ہیں تاکہ منزل مقصود کی طرف مزید رہنمائی ہوتی رہے۔

آئینۂ حق نما روح اور جسم کو یکجا کرنے میں حکمت یہ تھی کہ نور اور جسم کی تاریکی کو یکجا کرکے ایک ایسا آئینہ بنایا جائے کہ جس میں اسما و صفاتِ حق کا عکس قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور محبوب حقیقی اپنا حسن و جمال اس آئینہ کے اندر دیکھ سکے۔ فرمان ہوتا ہے۔

كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِياً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (میں ایک مخفی خزانہ تھا یعنی جمیع کمالات حسن و جمال کا خزانہ تھا مجھے اس بات کی حُب ہوئی کہ پہچانا جاؤں پس میں نے خلق کو پیدا کیا) نور و ظلمت کے اس اجتماع سے آئینہ تیار کرنے اور اس آئینہ (مجموعہ کمالات یعنی انسان) کو خلیفۃ اللہ بنا کر دنیا میں بطور نائب حق مامور کرنے کو ایک اور آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (ہم نے اس امانت کو آسمانوں۔ زمین اور پہاڑوں کو پیش کیا۔ لیکن اُنھوں نے اُٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور اسے انسان نے اُٹھا لیا۔ بے شک وہ ظلومی اور جہولی تھا)۔ اس امانت کو آسمان یعنی آسمان والے (فرشتے) اس لئے نہ برداشت کر سکے کہ وہ سراپا نور تھے اور زمین اور پہاڑ اس لئے نہ اُٹھا سکے کہ وہ سراپا ظلمت تھے لیکن چونکہ انسان روح اور جسم کا مجموعہ تھے اس کا ایک پہلو نورانی اور ایک تاریک ہونے کی وجہ سے یہ مکمل آئینہ بن گیا اور محبوب حقیقی کے حسن و جمال کا عکس قبول کرنے کے قابل ہو گیا۔ عکس کا قبول کرنا کیا ہے اللہ تعالےٰ کے اسمار و صفات سے متصف ہونے کی صلاحیت کا نام ہے جس کی وجہ سے اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیفَہ (میں دنیا میں خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں) کے مصداق وہ خلافتِ ارضی سے نوازا گیا۔

یہی خلافت یا نیابت الٰہیہ وہ امانت ہے جس کا انسان حامل ہوا۔ بعض لوگ ظلوماً جہولاً سے ظالم اور جاہل مراد لیتے ہیں حالانکہ اللہ تعالےٰ اس آیت میں حضرتِ انسان کی

تعریف فرما رہے ہیں نہ کہ مذمت جس امانت کو فرشتوں، زمین اور پہاڑوں نے اُٹھانے سے انکار کیا اگر حضرتِ انسان اُسے قبول کرے تو یہ کام قابلِ ستائش ہونا چاہیے یا قابلِ مذمت۔

خواجہ حافظ شیرازی نے شاعرانہ انداز میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے ؎

آسمان بارِ امانت نہ توانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

(جو بارِ آسمان اور زمین سے نہ اُٹھ سکا ؛ تونے غضب کیا دلِ شیدا اُٹھالیا)

شانِ محبوبیت

حضرت غوث الاعظم قدس سرہ نے اپنے الہامات جمع کئے ہیں اور سید محمد گیسودراز نے ان کی شرح لکھی ہے۔ ان الہامات میں سے پہلا الہام یہ ہے:

نِعْمَ الطَّالِبُ اَنَا وَ نِعْمَ الْمَطْلُوبُ الْاِنْسَانُ

(اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ بہترین طالب میں ہوں اور بہترین مطلوب انسان ہے)

یہ شرف مطلوبیت اور محبوبیت اُسے کیسے نصیب ہوا۔ اس وجہ سے اس کے اندر حق تعالےٰ کے اسماء و صفات اور کمالاتِ حسن و جمال کا پرتو ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ اور فی انفسکم افلا تبصرون میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

مقصدِ حیات

مقصدِ حیات کی ایک جھلک تو اوپر کی تمہید سے آپ کے سامنے آ گئی ہو گی آئیں اب ہم قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا مزید تعین کرتے ہیں۔ قرآنِ عظیم میں حق تعالےٰ فرماتے ہیں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (نہیں پیدا کیا میں نے جن اور انسان کو بجز اس کام کے کہ وہ میری عبادت کا حق ادا کریں) قرآنِ عظیم کی ہر آیت میں ایک جامعیت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ اور اس باطن کا ایک باطن ہے یہاں تک کہ سات بواطن ہیں۔ چنانچہ آیۂ مذکور

میں جہاں اللہ تعالیٰ عوام الناس کے لئے اطاعت و بندگی کا حکم فرماتے ہیں وہاں خواص اور خاص الخاص کے لئے بلند ترین منازلِ قرب پر پہنچنے کا اشارہ فرماتے ہیں ۔ حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ جو تفسیرِ قرآن میں خاص ملکہ رکھتے تھے فرماتے ہیں کہ لیعبدون سے مراد لِیَعْرِفُوْنَ ہے یعنی قرب و معرفت حاصل کرنا۔ یاد رہے کہ (جیسا کہ تفصیل سے اگلے باب میں آرہا ہے) جب انسان مقامِ فنا فی اللہ سے نکل کر بقا باللہ پر آتا ہے یعنی فنا کے استغراق سے نکل کر بقا کی ہوشیاری میں واپس آتا ہے وہ حدیثِ نبوی تخلقوا باخلاق اللہ کے مصداق اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات سے متصف ہو کر بی یسمع و بی یبصر وا کے مقام پر پہنچ کر نیابتِ الٰہیہ اور خلافتِ حقہ کے فرائض انجام دیتا ہے یہ دوئی کا مقام ہے جہاں ہر انسان بطور انسانِ کامل حقیقی معنوں میں عبد بن کر حقِ عبودیت ادا کرتا ہے۔ اس لئے فنا کے بعد مقامِ دوئی میں واپس آنے کا دوسرا نام مقامِ عبدیت یا مقامِ عبودیت بھی ہے اور یہی مقام انسانی عروج کا سب سے بلند ترین مقام ہے اور پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خاصہ ہے جہاں حضرت آدم علیہ السلام کو صفی اللہ۔ حضرت نوح علیہ السلام کو نجی اللہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ کا لقب دیا گیا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبدہٗ و رسولہٗ کے لقب سے نوازا گیا ہے لہٰذا اس آیۂ پاک کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کو مقامِ عبدیت پر پہنچنے اور فرائض خلافتِ الٰہیہ انجام دینے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور یہ بلند ترین مقام ہے کیونکہ فنا میں رہ کر آدمی ہمیشہ کے لئے غرق ہو جاتا ہے اور دنیاوی امور سر انجام نہیں دے سکتا۔ عیسائی۔ ہندو اور بدھ مذہب وغیرہ کا انسانی کمال یہ تھا کہ ہمیشہ کے لئے ذات میں فنا ہو کر گوشہ نشین ہو جائیں لیکن اسلام نے الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی کا نعرہ مار کر انسان کو عروجِ انسانی کی آخری منزل پر پہنچا دیا وہ منزل کہ جہاں تک اس سے پہلے کسی کی رسائی نہ ہوئی تھی۔

مقصدِ حیات کا تعین ایک اور آیت سے بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (عبادت کرتا رہ اپنے رب کی یہاں تک کہ مقامِ یقین حاصل ہو جائے)

اب اس عبادت سے کیا مراد ہے۔ اللہ تعالےٰ کی ذات میں یقین تو پہلے ہی تھا جب ہی عبادت شروع کی پھر اس کے کیا معنی کہ عبادت کرتا رہ بعض مفسرین یقین سے موت مراد لیتے ہیں لیکن یہ تو تاویل ہوئی یقین سے مراد ہی حق الیقین ہے جس کا ذکر دوسرے باب میں ہو چکا ہے وہی مقامِ فنافی اللہ جہاں پہنچ کر ذاتِ حق میں سالک ایک ہو جاتا ہے اور اسی وقت کے لئے عارضی طور پر عبادت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ لیکن فنا سے نکل کر بقا اور عبدیت میں آنے کے بعد پھر عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ فنا فی اللہ عرصۂ دراز تک قائم نہیں رہتی بلکہ عارضی ہوتی ہے مراقبات میں مشغولی کے وقت یہ حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آنکھیں کھولنے سے وہ حالت رفع ہو جاتی ہے۔ اگر رہ بھی جائے تو عبادت میں حارج نہیں ہوتی۔ جو لوگ ہمیشہ کے لئے ذاتِ حق میں مستغرق ہو جاتے ہیں وہ کم ظرف ہوتے ہیں جو ایک دو پیالے پی کر مست ہو جاتے ہیں لیکن ایسے لوگ اُمّتِ محمدیہ میں بہت کم ہوئے ہیں۔ ان کو عرفِ عام میں مجذوب کہتے ہیں۔ امتِ محمدیہ میں کثرت اُن بلا نوش حضرات کی ہے جو پیالہ نہیں، صراحی نہیں، ندی نہیں، نالہ نہیں دریا نوش کر جاتے ہیں اور دم نہیں مارتے اس کیفیت کو حضرت خواجہ غلام فریدؒ نے ایک کافی میں یوں بیان فرمایا ہے:

توڑیں جو دریا نوش ہن — پر جوش بھی خاموش ہن

اسرار دے سرپوش ہن — صامت رہن مارن نہ بک

(اگرچہ سالکینِ راہِ حقیقت دریا پر دریا نوش کر جاتے ہیں لیکن جوش و خروش کے عالم میں خاموش رہتے ہیں۔ اسرارِ الٰہی کا دریا ان کے قلوب میں موجزن ہوتا ہے لیکن ذرہ بھر اظہار نہیں کرتے۔

مقصدِ حیات کا تعین ایک اور آیت میں یوں کیا گیا ہے:

وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (اللہ تعالےٰ کی طرف وسیلہ تلاش کرو) اس میں بھی

وصول الی اللہ اور قرب و معرفت حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

نیز فرمایا وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌ بِالۡعِبَادِ (جو لوگ اپنے آپ اللہ کی رضا جوئی کے عوض فروخت کر دیتے ہیں اللہ تعالٰے ان بندوں سے کمال شفقت سے پیش آتے ہیں) مولانا اشرف علی تھانویؒ جن کو انجان لوگ وہابی کہتے ہیں، فرماتے ہیں کہ اس آیت کو ہم ہمیشہ پڑھتے تھے لیکن حقیقی معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ جب ہم نے اپنے پیر و مرشد کی غلامی اختیار کی ہے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس آیت میں معرفت کے چاروں مقام یعنی فنا فی اللہ۔ بقا باللہ۔ رضا الٰہی اور عبودیت موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ رضائے حق تعالٰے کی خاطر اپنے نفوس کو یعنی اپنے آپ کو قربان کر دیتے ہیں اور مقام فنا فی اللہ حاصل کر لیتے ہیں تو اللہ تعالٰے ان سے راضی ہوتا ہے۔ یہ مقام رضا ہے جو بعض صوفیاء کرام کے نزدیک سب سے بلند مقام ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے اللہ تعالٰے رَءُوۡفٌ العباد ہو جاتے ہیں۔ رافت کہتے کمالِ شفقت کو اور کمالِ شفقت یہ ہے کہ اللہ تعالٰے اپنے بندہ کو مقام محبوبیت دے دے اور لفظ عباد سے مراد مقامِ عبدیت ہے یعنی جب آدمی فنا سے نکل کر بقا میں پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالٰی اس سے راضی ہوتے ہیں اور اس کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔

مقصدِ حیات احادیثِ نبوی کی رُو سے

یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن عظیم نے جو مقصدِ حیات متعین کیا ہے۔ احادیث نبوی میں اس سے مختلف مقصد نہیں ہو سکتا کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر قرآن مجید کو کسی نے نہیں سمجھا لیکن مقصدِ حیات کو زیادہ سے زیادہ آیات و احادیث سے ثابت کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ بعض علماء کرام ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک مقصدِ حیات صرف یہ ہے کہ اللہ تعالٰے کے احکام کا علم ہو جائے تاکہ ان پر عمل کر کے دوزخ سے بچ سکیں اور بہشت میں جا سکیں۔ یہ تو نہایت ہی کم ہمت اور ادنٰی لوگوں کا مقصدِ حیات ہے کیونکہ جب تک عشق و محبت کا ولولہ پیدا کر کے حق تعالٰے کی تہ دل سے اور کمالِ محبت سے عبادت نہ کی جائے طلبِ بہشت

اور خوفِ دوزخ ایک نفسانی خواہش رہ جاتی ہے۔ یہ دوسرے معنوں میں نفس پرستی ہے حق پرستی نہیں۔ اسی خلوص نیت کی بنا پر تو ہمارے رندشاعر مرزا غالب چلا اُٹھے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

ایک دفعہ حضرت رابعہ بصریؒ جوش کے عالم میں ایک ہاتھ میں آگ کی مشعل اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا لوٹا لئے جارہی تھیں کسی نے پوچھا کہاں جارہی ہو، فرمایا دوزخ کو بجھانے اور بہشت کو آگ لگانے جارہی ہوں کیونکہ سب لوگ دوزخ کے ڈر سے اور بہشت کے طمع پر عبادت کرتے ہیں خدا کے لئے خالص عبادت کوئی نہیں کرتا۔

ایک حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کو دوست بنانا جائز ہوتا تو میں ابوبکرؓ کو دوست بناتا۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عشق و محبت کا تعلق ہونا چاہیئے نہ کہ شریعت کے احکام معلوم کرکے دوزخ سے بچنے اور بہشت حاصل کرنے کی تدابیر

ایک اور حدیث میں آپؐ فرماتے ہیں کہ لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسْعَنِیْ مَلَکٌ الْمُقَرَّب وَنبیٌ الْمُرْسَل (یعنی مجھے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا قرب وصل ہوتا ہے کہ نہ کوئی مقرب فرشتہ اور نہ کوئی نبی وہاں تک پہنچ سکتا ہے) یہ عرفان کا بہت بلند مقام ہے جس کے حصول کے لئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور وِرثہ میں ساری اُمت کو کوشاں ہونا چاہیئے۔

نیز آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَاءَہٗ (جو شخص اللہ تعالیٰ کے قرب و وصال کا مشتاق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قرب و وصال کا مشتاق ہوتا ہے) نیز فرمایا اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ (جو شخص میرا ذکر کرتا ہے میں اس کا ہم نشین ہوتا ہوں) نیز فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر تم نہیں دیکھ سکتے تو وہ تم کو دیکھتا ہے۔ اس حدیثِ پاک میں

رویتِ حق کے حصول کی تاکید کی گئی ہے۔

ایک اور حدیث میں فرمایا رجعنا من جهاد الاصغر الی جهاد الاکبر (ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے ہیں) جب صحابہ نے عرض کیا کہ حضور دشمنانِ اسلام سے جہاد کرنے سے بڑا جہاد کیا ہے تو فرمایا جہاد بالنفس (نفس کے ساتھ جہاد) دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نفس سے جہاد کا نام جہادِ اکبر رکھا اور اس کی فضیلت دشمنانِ اسلام کے ساتھ جنگ کرنے سے بھی زیادہ ہے اور یہی وہ جہاد ہے جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رات دن مصروف رہتے تھے تاکہ نفس کا غلبہ دور ہو اور قرب الی اللہ کی دولت نصیب ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ ظاہر بین حضرات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری اسوۂ حسنہ کا اتباع تو بڑے جوش و خروش سے کرتے ہیں لیکن آپ کے باطنی اسوۂ حسنہ کا اتباع بالکل نہیں کرتے۔ آپ کو اللہ تعالےٰ کے ساتھ جو شدید عشق و محبت کا تعلق ہے اور جس کی بدولت آپ فنا و بقا اور قرب و معرفت کے بلند ترین مراتب پر متمکن ہو چکے تھے ظاہر بین حضرات اس کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے کیونکہ ان کا مطمعِ نظر تو حصولِ بہشت ہے ان کو یہ معلوم نہیں کہ اس نیت سے بہشت بھی نہیں ملنے کا۔ مثال کے طور پر جب کوئی شخص دیکھتا ہے کہ جو لوگ کسی بادشاہ سے ملنے کی خواہش کرتے ہیں تو بادشاہ ان کو اپنے پاس طلب کر کے محلات میں مہمان رکھتا ہے عمدہ کھانے کھلاتا ہے۔ خدام سے خدمت کراتا ہے۔ عیش و عشرت کا سامان مہیا کرتا ہے تو اس شخص کے دل میں مہمان بننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تاکہ وہ بھی محلات میں رہے اور اچھے اچھے کھانے کھائے۔ لیکن جہاں پہلے آدمی کی نیت بادشاہ کی محبت اور شوقِ ملاقات تھی۔ دوسرے شخص کی نیت محض محلات میں رہنا اور اچھے اچھے کھانے کھانا ہے اگر بادشاہ کو دل کی بات معلوم کرنے کی طاقت ہے تو دوسرے شخص کو نزدیک نہیں آنے دے گا کیونکہ اُسے بادشاہ کی خواہش نہیں بلکہ اس کے محلات میں رہنے کی ہے۔ لہذا آپ خود فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ جس شخص کی نیت بہشت کے مزے اُڑانے کی ہے وہ بادشاہ

حقیقی کی نظروں میں کہاں مقبول ہو سکتا ہے۔ اس کو نزدیک ہی نہیں آنے دیا جائے گا۔ لہٰذا جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی بجائے بہشت کی محبّت دامنگیر ہے وہ تو سلطان محمودؒ غزنوی کی لونڈی سے بھی کم عقل نکلے۔ ایک دفعہ سلطان محمود غزنویؒ نے فرطِ جود و سخا میں آکر اپنا سارا ساز و سامان میدان میں لگا دیا اور اپنے خدّام اور درباریوں کو حکم دیا کہ جو شخص جس چیز پر ہاتھ رکھ دے وہ اس کی ملکیت ہو جائے گی۔ اب کیا تھا سب لوگ مجنونانہ وار دوڑ دوڑ کر کے اپنی پسند کی چیزوں پر ہاتھ رکھ رہے تھے۔ کوئی گھوڑے پر ہاتھ رکھ رہا تھا۔ کوئی ہاتھی پر۔ کوئی سونے پر کوئی چاندی پہ۔ اس اثنا میں بادشاہ کی لونڈی آئی۔ بادشاہ نے اُسے دیکھ کر کہا اری تو بھی کسی چیز پر ہاتھ رکھ دے۔ اس نے آگے بڑھ کر بادشاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بادشاہ عہد کا پکا تھا۔ اب وہ اس کا ہو چکا تھا لہٰذا اس کو اپنے نکاح میں لے لیا اور وہ ملکہ بن گئی۔ دیکھئے کس قدر عقلمند تھی۔ بادشاہ کے مال کی پرواہ نہیں، خود بادشاہ پر نظر ہے۔ یہ ہے مومن کی شان کہ اس کا مقصود اور مطلوب اللہ ہے نہ جاہ نہ عزّت نہ ملک نہ مال۔ نہ بہشت۔ بہشت اُس کو ضرور ملے گی لیکن ضمناً ملے گی۔ اگر کوئی شخص اُسے منزلِ مقصود یا مطمحِ نظر بنائے گا تو نہیں ملے گی کیونکہ ظاہری بادشاہ کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے اللہ تعالیٰ کو کوئی شخص دھوکہ نہیں دے سکتا۔ حکم ہوتا ہے کہ قل انّ صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین (یعنی میری نماز میرے روزے، میری قربانیوں، میری زندگی اور میری موت کا مرجع اور مقصود تیری ذات ہے) اس لئے مشائخ عظام نے کہا ہے کہ دنیا کے تمام مشاغل زندہ رہنے کے لئے ہیں اور زندہ رہنا محبوب کے لئے ہے۔ گویا دنیا کے تمام کام مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ ہے ایک مومن کی زندگی کا مقصد۔ اگر کوئی شخص اس کے علاوہ مقصدِ زندگی مقرر کرتا ہے تو وہ مشرک ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:

'خوردن برائے زیستن است نہ زیستن برائے خوردن'

(کھانا اس لئے کھایا جائے کہ زندہ رہ سکے نہ کہ زندگی کا مقصد خورد و نوش مقرر کرے)

اب بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ہر شخص ولی بن سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ ولایت نہایت ہی بلند مقام ہے جو خاصانِ خدا کے لئے مخصوص ہے لیکن آپ کو کس نے بتایا ہے کہ آپ ان میں شمار نہیں ہوتے۔ یہ عشق کی دنیا ہے جس شخص میں عشق زیادہ ہے وہ مقامِ قرب میں پہنچنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے خواہ وہ بظاہر کیسی ہی زندگی گزار رہا ہے۔ یہاں عشق کی بڑی قدر ہے۔ عاشق کی طلب میں خدا تعالیٰ خود رہتا ہے۔ باقی لوگ مرید ہوتے ہیں لیکن عاشق مراد ہوتے ہیں۔ مرید تلاش کرتا ہے اور مراد کو تلاش کیا جاتا ہے۔ اگر یہ دولت بھی پاس نہ ہو تو یہ بات ضرور حاصل ہوگی کہ جو شخص پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کرے گا وہ کسی بلندی تک تو پہنچ جائے گا یا کم سے کم اُس گٹر (گندی نالی) سے تو نکل جائے گا جس میں اُسے خواہشاتِ نفسانی نے ڈال رکھا ہے۔ اسی لئے مولانا رومؒ کا مشورہ یہ ہے کہ ؎

اندریں رہ مے تراش و مے خراش

تادمِ آخر دمے فارغ مباش

(اس راستے میں جان کی بازی لگادو۔ اور مرتے دم تک کوشش جاری رکھو)

چوتھا باب

سلوک الی اللہ یعنی طریقِ حصولِ مقصدِ حیات

تصوف جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے انسان مجموعہ ہے روح اور جسم کا۔ لہٰذا جب تک روح اور جسم دونوں کی نشو و نما اور ترقی نہ ہو انسانی ترقی کا دعویٰ غلط ہے۔ اس اندرونی اور باطنی ترقی و اصلاح کے علم کو علمِ روحانیت یا تصوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ایک اعتراض بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ لفظِ تصوف چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں مروج نہیں تھا اس لئے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ دوسرے مذاہب یعنی عیسائیت۔ ہندو دھرم۔ بدھ مت اور فلسفۂ یونان سے حاصل کیا گیا۔ یہ اعتراض کم علمی اور کج فہمی پر مبنی ہے۔ بات یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو علم تفسیر۔ فقہ۔ حدیث۔ علم معانی۔ علم بیان۔ علم صرف و نحو وغیرہ بھی مروج نہ تھے۔ کیا یہ علوم بھی غیر اسلامی ہیں ؟

علوم کے مروّج نہ ہونے کی وجہ ان تمام علوم کے مروج نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بالکل قلیل یعنی صرف تیئیس ۲۳ برس تھا۔ اس قلیل مدت میں آپ نے جس قدر عظیم الشان امور سرانجام دئے وہ معجزہ سے کم نہیں۔ اس تھوڑے عرصے میں آپ نے لاکھوں کو دولتِ اسلام سے

مشرف کیا۔ ان کی ظاہری اور باطنی اصلاح فرمائی۔ دشمنانِ اسلام کے ساتھ مسلسل جہاد کیا۔ جہاں داری، جہاں رانی اور جہاں بانی کے اصول و قوانین مقرر فرمائے۔ اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ بیرونی طاقتوں سے تعلقات قائم کئے۔ قرآن مجید پر عمل کر کے لوگوں کو اس کے معانی و مطالب سے آگاہ فرمایا۔ غرضیکہ اس قدر مصروف و منہمک رہے کہ ان علوم کے مرتب اور مدوّن کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صحابۂ کرام ان علوم سے بے بہرہ تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کی بدولت صحابۂ کرام ظاہری اور باطنی اصلاح اور ترقی سے پوری طرح مزین اور مستفیض ہو چکے تھے۔ وہ ماہرینِ روحانیت تھے لیکن اس کی اصطلاحات اور لفظی باریکیوں کو نکھارنے کا اُن کے پاس وقت نہ تھا جس طرح ایک کسان کھیتی باڑی میں ماہر ہوتا ہے لیکن کھیتی باڑی پر اس کے پاس کوئی کتاب نہیں ہوتی۔ یا ایک ملاّح جہاز رانی میں ماہرِ فن ہوتا ہے لیکن تحریری طور پر اس کے پاس کوئی ضابطۂ جہاز رانی نہیں ہوتا۔ یا جس طرح ایک معمار فنِ تعمیر میں ماہر ہوتا ہے لیکن علمِ تعمیر پر اس کے پاس کوئی کتاب نہیں ہوتی۔ یا جس طرح فنِ تیراکی میں ماہر کے پاس تیراکی پر کوئی کتاب نہ ہو۔ اسی طرح صحابۂ کرام اسلامی تعلیمات سے روحانی ترقی کر کے منزلِ مقصود تک پہنچ چکے تھے یعنی فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے مقامات حاصل کر چکے تھے لیکن اُس وقت اُن کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ اپنے تجربہ جات اور روحانی ترقی کے اصول اور منازل و مقامات پر کتابیں لکھتے۔ لیکن قرآنی آیات۔ احادیث نبوی اور صحابۂ کرام کے اقوال و احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلند ترین منازلِ قرب تک پہنچ چکے تھے اور دولت کشف و عرفان سے مالامال تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسجد نبوی میں ممبر پر کھڑے ہوئے دو ہزار میل دور ایران میں جنگ میں مصروف جرنیل ساریہ رضی اللہ عنہ کو آواز دینا کہ پہاڑ کی جانب توجہ کرو جہاں دشمن جمع ہو رہا تھا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ آپ دولتِ کشف و کرامات سے مالامال تھے۔ اسی طرح جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے تو آپ نے فرمایا کہ میں اس خدا

کی پرستش کیسے کروں جب تک کہ اسے دیکھ نہ لوں۔ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو کیسے دیکھا جاتا ہے تو فرمایا کہ اللہ کو ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ جب حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ کیسے ہیں تو فرمایا " قَرِیْبٌ من الاشیاءِ غیر مُلَامِسٍ بَعِیْدٌ مِنْھَا غَیْرُ مُبَایِنٍ. مُتَکَلِّمٌ لا بِرَوِیَّۃٍ. مُرِیْدٌ لَا بِھِمَّۃٍ صَانِعٌ لا بِجَارِحَۃٍ۔ لَطِیْفٌ لایُوصَفُ بالخفاء بَصِیْرٌ لا یوصف بالحاسۃِ رَحِیْمٌ لایوصف بالرقۃِ (قریب ہے لیکن چھوا نہیں جاتا۔ بعید ہے لیکن علیحدہ نہیں۔ کلام کرتا ہے بغیر دکھائی دیئے۔ ارادہ کرتا ہے بغیر مشقت کے۔ صانع ہے بغیر تکلیف کے لطیف ہے لیکن مخفی نہیں۔ بصیر ہے بغیر حساس کے۔ رحیم ہے بغیر رقت کے۔) اسی طرح حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آں حضرت نے مجھے دو علم عطا فرمائے ہیں ایک وہ جو میں نے تم کو بتا دیا ہے (یعنی علم حدیث) دوسرا وہ علم ہے کہ اگر ظاہر کروں تو تم میری گردن کاٹ دو گے۔ اس سے مراد علم باطن ہے۔ غرضیکہ صحابۂ کرام کے حالات میں اس قسم کے واقعات کثرت سے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صحابۂ کرام روحانی ترقی کی بلند ترین منازل پہ پہنچ چکے تھے۔ بلکہ تمام صوفیاء کرام کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ بعد کے زمانے کا بڑے سے بڑا ولی اللہ خواہ وہ غوث ہو یا قطب ایک ادنیٰ صحابی کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا یہی وجہ ہے کہ حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رح نے فرمایا کہ بعض لوگ حضرت امیر معاویہ کو ادنیٰ درجہ کا صحابی سمجھتے ہیں لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ان کے گھوڑے کے سُم کی خاک میری آنکھوں میں چلی جائے تو مجھے اپنی نجات کا یقین ہو جائے گا۔

تصوّف کے ارکان

تصوف مشتمل ہے چار ارکان پہ۔ شریعت۔ طریقت۔ معرفت اور حقیقت۔ شریعت بمنزلہ نسخہ ہے۔ طریقت نسخہ پر عمل کرنے کا نام ہے۔ معرفت اس روشنی کا نام ہے جو عمل کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور حقیقت وہ چیز ہے جو معرفت کی روشنی سے نظر آتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شریعت تصوف کی بنیاد ہے اور یہی تمام صوفیائے کرام کا عقیدہ اور عمل رہا ہے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے شرح

مثنوی مولانا رومؒ کے آغاز میں تصوف کی حقیقت کے متعلق یہ حدیث نقل کی ہے اَلشَّرِیعَتُ اَقْوَالِیُ وَالطَّرِیقَتُ اَفْعَالِیُ وَالْمَعْرِفَۃُ اَحْوَالِیُ وَالْحَقِیقَتُ سِرِّیُ (یعنی حضورؐ نے فرمایا کہ شریعت میرے اقوال کا نام ہے۔ طریقت میرے اعمال کا۔ معرفت میرے احوال یعنی کیفیات روحانی کا اور حقیقت میرے اسرار و رموز کا نام ہے)

امام مالکؒ کا قول ہے کہ: مَنْ تَصَوَّفَ وَلَا تَفَقَّهَ تَزَندَقَ مَنْ تَفَقَّهَ وَلَا تَصَوَّفَ تَفَسَّقَ من جَمَعَ بَیْنَهُمَا تَحَقَّقَ (جس نے تصوف پر عمل کیا لیکن فقہ نہ سیکھا وہ گمراہ ہوا۔ جس نے فقہ سیکھا لیکن تصوف نہ سیکھا وہ فسق و فجور میں مبتلا ہوا۔ جس نے دونوں کو جمع کیا وہ حقیقت کو پہنچا۔

اس سے ظاہر ہے تصوف اور شریعت میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ تصوف کہو یا طریقت یہ شریعت کی جان ہے اور روح اسلام ہے۔ روحانیت کے بغیر اسلام ایک خالی ڈھانچہ اور مردہ جسم ہے۔ اسلام اپنی روحانیت کی بدولت قلیل مدت میں دوسرے مذاہب پر غالب آگیا اور بڑی بڑی سلطنتیں اس کے سامنے دب گئیں۔ ہمارے زوال کی اصلی وجہ یہی ہے کہ علم ظاہر تو بہت ہے لیکن علمِ روحانیت کی کمی ہے جب تک علمِ روحانیت کو از سرِ نو دنیا میں نہیں پھیلایا جائے گا۔ تاریکی۔ جہل۔ گمراہی اور بدامنی کا خاتمہ نہیں ہوگا۔

جاہلوں نے تصوف کو چیستاں بنا رکھا ہے

جاہل صوفیوں اور خود غرض ڈبہ پیروں نے تصوف کو چیستاں بنا رکھا ہے۔ وہ نہ اسلام کو جانتے ہیں نہ شریعت کو اور نہ ہی تصوف سے واقف ہیں۔ اسلامی فرائض نماز روزہ حج زکوٰۃ اور دیگر پابندیوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے انھوں نے عام لوگوں میں تصوف اور فقیری کے متعلق من گھڑت قصے بنا رکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شریعت اور چیز ہے فقیری اور چیز ہے۔ فقیری حاصل کرنے کے لئے آدمی کو گھر بار، بال بچے، مال دولت، رشتہ دار وغیرہ چھوڑ چھاڑ کر ویرانوں میں رہنا پڑتا ہے۔ اور مست قلندر بن کر پھٹے پرانے کپڑوں میں رہنا پڑتا ہے۔ روزی کمانے کی بجائے غیب سے کوئی چیز ملنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے

کوئی چیز مل جائے تو کھالیا اور نہ ملے تو صبر کرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کے عقائد کو ثابت کرنے کے لئے وہ بڑے بڑے بزرگوں کا نام لیتے ہیں اور اُن کے متعلق من گھڑت قصے کہانیاں لوگوں کو سناتے پھرتے ہیں۔ یہ سب غلط اور بے بنیاد چیزیں ہیں تصوف ہو یا طریقت فقیری ہو یا درویشی یہ سیدھا سادہ اسلام ہے۔ نہ اس میں ترکِ دنیا ضروری ہے نہ گھر بار چھوڑنا اور نہ پھٹے پرانے کپڑے پہننا ضروری ہے۔ ہاں جو بات اس میں ضروری ہے اور جسے یہ غیر ضروری بتاتے ہیں وہ شریعت کی پابندی اور صوم و صلوٰۃ میں مستعدی ہے۔ صحابۂ کرامؓ کو دیکھو کاروبار کرتے تھے۔ جہاد کرتے تھے۔ نمازیں پڑھتے روزے رکھتے تھے۔ حج کو جاتے تھے۔ شادی بیاہ کرتے تھے بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے اور اس کے ساتھ شب بیدار بھی تھے ذاکر و شاغل بھی تھے۔ روحانی منازل و مقامات بھی طے کرتے تھے اور خدا رسیدہ بھی تھے اسی طرح اکابر صوفیاء و مشائخ کی زندگیوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے اکثر حضرات روزی کمانے کے لئے کوئی نہ کوئی کام کرتے تھے۔ مثلاً حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ تجارت کرتے تھے اور آپ کا مال دور دراز ملکوں میں جہازوں کے ذریعے بھیجا جاتا تھا۔ شیخ فریدالدین عطارؒ عطر فروش تھے۔ حضرت ابوبکر وراقؒ کاغذ کی تجارت کرتے تھے۔ عمر خیام جو مشہور شاعر ہیں اور بعد میں صوفی ہوئے خیمہ بناتے تھے۔ حضرت ابوالعباس قصاب قصائیوں کا کام کرتے تھے۔ بعض حضرات جوتے بناتے تھے۔ بعض کھیتی باڑی کرتے تھے۔ بعض صنعت و حرفت میں مشغول تھے۔ یہ حضرات بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے خوب اہتمام کرتے تھے اور جب تک وہ اسلامی علوم میں تحصیل تمام نہیں کر لیتے تھے ان کو چین نہیں آتا تھا۔ صوم و صلوٰۃ کی ادائیگی میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان میں سے اکثر ایسے حضرات تھے جو برسوں تک عشاء کی نماز کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض حضرات فقر و فاقہ میں زندگی بسر کرتے تھے لیکن ان کا یہ فقر و فاقہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اختیاری ہوتا تھا نہ کہ اضطراری۔ جو کچھ اُن کے پاس ہوتا

راہ حق میں غربا، ومساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ بعض حضرات اس لئے روزی کمانے سے اجتناب کرتے تھے کہ وہ ہمہ تن او ہمہ وقت ہدایتِ خلق میں مصروف رہتے تھے لیکن ان کی بسر اوقات کے لئے امرا، وسلاطین وظائف مقرر کر دیتے تھے تاکہ ان کے ہدایتِ خلق جیسے اہم ترین فریضہ میں حرج نہ آئے۔ یہ بات جائز ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روزی کمانے کے لئے کوئی پیشہ اختیار کرتے تو خلقِ خدا کو ہدایت کون دیتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رض خلیفۃ المسلمین منتخب ہونے کے دوسرے روز کپڑوں کے تھان کندھے پر اٹھا کر خرید و فروخت کے لئے بازار چل دیئے۔ حضرت عمر رض نے جب دیکھا تو عرض کیا کہ حضرت اگر آپ نے تجارت کی تو خلافت کے فرائض کون ادا کرے گا۔ اس کے بعد انھوں نے بیت المال سے ایک حقیر سی رقم اپنے لئے مقرر کر لی لیکن ایک دن جب آپ کی اہلیہ نے میٹھا تیار کیا اور آپ کے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ روزانہ ایک پیسہ بچت کر کے مہینے کے آخر میں میٹھا تیار کیا تھا تو آپ نے حکماً اپنی تنخواہ سے ایک پیسہ روزانہ کے حساب سے کم کر دیا اس خیال سے کہ ایک پیسہ کی بچت ہو سکتی ہے۔

دنیا میں آسان ترین کام وصالِ حق ہے

ہم قارئین کو یقین دلاتے ہیں اور ہمارا یہ اپنا تجربہ ہے اور ہزاروں لاکھوں سالکین راہ حقیقت کا تجربہ ہے کہ علم روحانیت حاصل کرنے اور مقامات و منازل طے کرنے کے لئے قطعاً گھر بار اور کاروبار ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔ شروع میں اس کام کے لئے نماز روزہ کی پابندی کے علاوہ کوئی نصف گھنٹہ کے قریب زائد کام یعنی ذکر اللہ میں مصروف ہونا پڑتا ہے۔ اس قسم کے کئی نصف گھنٹے ہم چائے اور سگریٹ نوشی یا دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں گزار دیتے ہیں مشائخ کے بتائے ہوئے ذکر و اذکار روزانہ آدھ گھنٹہ کرنے کی تاثیر دیکھ کر آپ کو خود احساس ہوگا کہ کام کس قدر تھوڑا ہے اور انعام کس قدر بلند۔ اس کام میں سب سے زیادہ جو چیز فائدہ دیتی ہے وہ خلوص نیت ہے، جو شخص محض حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی نیت سے روزانہ تھوڑا بہت وقت نکال کر یہ کام شروع کرتا ہے تو رحمتِ حق

اُسے گھر میں آ کر گھیر لیتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص میری طرف ایک ہاتھ چل کر آتا ہے میں اُس کی طرف دو ہاتھ چل کر آتا ہوں اور جو شخص چل کر میری طرف آتا ہے میں دوڑ کر اس کی طرف جاتا ہوں اب آپ بتائیں کہ دنیا میں کونسی ایسی چیز ہے کہ جو آپ کے پاس دوڑ کر آتی ہے ۔ اس لئے مشائخ عظام نے لکھا ہے کہ

دنیا کی سب سے بڑی کامیابی دُنیا کی سب سے بڑی کامیابی اور خوشی اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا ہے اور دنیا کی سب سے بڑی ناکامی اور نامرادی اللہ سے تعلق کا نہ ہونا ہے ۔ اور دنیا میں آسان ترین کام حق تعالیٰ کا قرب و وصال حاصل کرنا ہے اور کیوں نہ ہو جب آپ کے ایک قدم چلنے سے اللہ تعالیٰ دو قدم آپ کی طرف آتے ہیں تو اس سے زیادہ آسان کام کیا ہو سکتا ہے اور یہ بھی خیال فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کا ایک قدم کتنا بڑا ہو گا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کی نیت کر لیں وہ خود بخود آپ کے گھر تشریف لائیں گے ۔

بادشاہ کا گھر میں مہمان ہونا نازک بات ہے لیکن اس بات کا خیال کر لیں کہ جب آپ اتنے بڑے بادشاہ بلکہ بادشاہوں کے بادشاہ کو اپنے گھر پر آنے کی دعوت دیتے ہیں تو اس سے پہلے گھر کی صفائی لازمی ہے ۔ گھر کو صاف ستھرا کرنے کے علاوہ یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ خانہ دل میں کوئی غیر اللہ تو نہیں رہ گیا ۔ دوسرے الفاظ میں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس عظیم الشان مہمان کے ساتھ آپ نے کسی غیر کو تو دعوت نہیں دے دی یا پہلے سے کسی اور کو تو گھر میں نہیں بٹھا رکھا ۔ اگر آپ کے خانہ دل میں غیر کی محبت کا قبضہ ہے تو وہ عظیم الشان مہمان اندر نہیں آئے گا ۔ ایسے گھر میں آنے میں وہ اپنی بے عزتی خیال کرے گا ۔

سلوک الی اللہ کی حقیقت جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ سلوک الی اللہ یعنی اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ کوئی عجوبہ روزگار نہیں بلکہ سیدھا سادہ اسلامی احکام پر پابندی سے عمل کرنے کا نام ہے ۔

عقائد کی درستی سب سے پہلے اس میں عقائد کو درست کرنا پڑتا ہے وہی ایمان کی

شرطوں کو دہرایا جاتا ہے یعنی اللہ ایک ہے نبی برحق ہے۔ قرآن اللہ کی سچی کتاب ہے۔ قیامت، دوزخ و بہشت برحق ہیں تمام انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں برحق تھے اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی یعنی خاتم الانبیاء ہیں۔ نبوت اور رسالت آپ پر ختم ہے اور قیامت تک آپ کی نبوت جاری رہے گی۔ اختلافی مسائل میں اہل سنت و جماعت کا عقیدہ اختیار کرنا چاہیئے۔ یعنی ائمہ اربعہ حضرت امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعی اور امام احمدؒ بن حنبل سے جس امام کے مسلک پر چلے گا فلاح پائے گا۔ اُن کے درمیان اختلاف اصولی نہیں فروعی ہے۔

ارکانِ دین کی پابندی عقائد کی درستی کے بعد ارکانِ دین مثل نماز، روزہ حج زکوٰۃ کی پابندی لازمی ہے۔ ارکان دین کو ترک کرنا گناہِ کبیرہ ہے اور گناہِ کبیرہ کا مرتکب اللہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں توبہ کرنے سے سارے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

فضل اللہ حق تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے عبادات اور مجاہدات اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتے جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال نہ ہو۔ اللہ کے فضل کے بغیر یہ دولت کسب سے حاصل نہیں ہوتی اس لئے ہر وقت اللہ تعالیٰ سے فضل و کرم اور بے حساب رحمت اور بے حساب بخشش کی دعا کرنی چاہیئے۔ قرآن عظیم کہتا ہے:

ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيْ مَنْ يَّشَآءُ ط

(ایں سعادت بزورِ بازو نیست - تا نہ بخشد خدائے بخشندہ)

ضرورتِ شیخ سلوک الی اللہ طے کرنے میں شیخ یعنی پیر کامل سے بیعت ضروری ہے بعض حضرات ایسے ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ جذب کے ذریعے بغیر وساطتِ شیخ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں لیکن اس راہ میں اکثر و بیشتر کامیابی پیرِ کامل کے بغیر مشکل ہے۔ قرآنِ عظیم میں شیخ کامل کی صحبت و تربیت کی تاکید وارد ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (صادقین یعنی صادق الحال لوگوں کی صحبت

(اختیار کرو) صادق اُسے کہتے ہیں جس کا ایمان تقلید سے گزر کر تحقیق اور تصدیق تک پہنچ چکا ہو۔ یعنی وہ مرد کامل سُنی ہوئی چیزوں کو اپنی باطنی آنکھوں سے دیکھ کر تصدیق کر چکا ہو۔ نیز فرمایا فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ (جس بات کو تم نہیں جانتے اہلِ ذکر سے دریافت کرو) نیز فرمایا وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (اللہ تک پہنچنے کے لئے وسیلہ تلاش کرو) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک قوم میں شیخ کی وہی حیثیت ہے جو ایک اُمت میں نبی کی۔ نیز فرمایا کہ جس کا کوئی شیخ (مرشد) نہیں ہے اس کا شیطان شیخ ہوتا ہے۔ نیز فرمایا میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔ نیز فرمایا میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب اللہ دوسری اہلِ بیت۔ اہلِ بیت وہ کشتی ہے کہ اس پر بیٹھ کر تم گمراہ نہیں ہوگے۔

اُستاد کے بغیر دُنیا کا کوئی کام نہیں ہو سکتا

اللہ تعالےٰ تک رسائی حاصل کرنا تو بڑی چیز ہے دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے کام سیکھنے کے لئے بھی اُستاد کے بغیر کام نہیں بنتا۔ ڈاکٹر سے تعلیم حاصل کئے بغیر کوئی شخص ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ انجنیئر سے تربیت حاصل کئے بغیر کوئی شخص انجنیئر نہیں بن سکتا۔ تیراکی۔ گھوڑسواری، کھیتی باڑی۔ سپہ گری وغیرہ آدمی کوئی کام کتابیں پڑھ کر نہیں سیکھ سکتا بلکہ اُستادِ کامل کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ تو ظاہری امور ہیں جو آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں لیکن روحانیات میں تو ارواح سے تعلق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اور پیغمبر اسلامؐ سے تعلق ہوتا ہے جو آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ اس لئے اس کام میں دیگر کاموں سے زیادہ استادِ کامل کی ضرورت ہوتی ہے اگر اُستاد کے بغیر ہدایت کا کام ممکن ہوتا تو اللہ تعالےٰ ہر زمانے میں کتاب نازل کر دیتے اور انبیاء کو مبعوث کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ لیکن سنت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ کتاب کے ساتھ معلمِ کتاب کی بھی ضرورت ہوتی۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد ضرورت شیخ ختم ہو گئی کیونکہ آپ نے قرآن پر عمل کر کے دکھا دیا کہ اس طرح یہ کام کیا جا سکتا ہے

اور آپ کے عمل کا سارا حال احادیثِ نبوی میں موجود ہے۔ یہ استدلال غلط ہے۔ اگر صحیح ہوتا تو آپ کے بعد نہ قرآن میں صادقین کی صحبت اختیار کرنے کی تاکید ہوتی نہ احادیث میں شیخ کی ضرورت پر زور دیا جاتا نہ صحابۂ کرام اور ائمہ اہلِ بیت کی اقتدا کی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تاکید فرماتے بلکہ قرآن و حدیث کو کافی سمجھتے لیکن یہ نہیں کیا گیا اور جا بجا آں حضرت کی تعلیمات میں ہادی اور رہبر اور شیخِ کامل سے تربیت حاصل کرنے کی تاکید آئی ہے۔

جس طرح صحابۂ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذاتی طور پر ہدایت حاصل کرنے کی ضرورت تھی اسی طرح آنحضرت کی پردہ پوشی کے بعد آپؐ کے خلفا اور جانشینوں سے ہدایت کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں نبوت کے چار منصب بتائے گئے ہیں۔ یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ انبیاء علیہم السلام قرآن کی آیات پڑھ کر لوگوں کو سناتے ہیں۔ ان کا تزکیۂ نفس کرتے ہیں۔ ان کو کتاب اللہ کے مطابق تعلیم و تربیت دیتے ہیں اور حکمت یعنی اسرار و رموزِ حق تعالیٰ سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان چار کاموں میں سے صرف پہلا کام معلّم کے بغیر ممکن ہے باقی تین کام یعنی لوگوں کا باطنی توجہ سے تزکیۂ نفس کرنا، احکامِ خداوندی کی روشنی میں لوگوں کی تربیت کرنا اور اُن کو اسرار و رموز سکھانا شیخِ کامل اور پیرِ روشن ضمیر کے بغیر ناممکن ہیں۔ ان کاموں کے لئے شخصی عنصر PERSONAL ELEMENT کی ازحد ضرورت ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رُخِ انور کی زیارت، آپ کے تکلّم اور آپ کے چھونے سے صحابۂ کرام کے روحانی مراتب طے ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ جب آں حضرتؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص سچا ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ کو اپنے بال بچوں اور مال و دولت اور جان سے زیادہ عزیز نہیں رکھتا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ حضور میں اپنے اندر یہ کیفیت محسوس نہیں کرتا۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم محسوس نہیں کرتے اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ حضور اب محسوس کرتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ آپ کے ہمکلام

ہونے سے یہ دولت حاصل ہوگئی۔ ایک دفعہ ایک صحابی کو آں حضرت کسی علاقہ کا عامل مقرر کرکے بھیج رہے تھے اس نے عرض کیا کہ حضورؐ میں اپنے اندر یہ قابلیت محسوس نہیں کرتا۔ آپؐ نے اس کے کندھے کو ہاتھ لگایا تو وہ چلا اُٹھا کہ حضور اب محسوس کرتا ہوں۔ حضرت سلمان فارسیؓ جب پہلی دفعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رُخِ انور پر نظر پڑتے ہی آپ کے روحانی مراتب بلند ہوگئے اور آتے ہی قدموں پہ گر کر مسلمان ہوگئے۔ کیا یہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے زیادتی نہ ہوتی کہ صحابہ کرام رضؓ تو آں حضرتؐ کی صحبت اور باطنی توجہ سے اس قدر فائدہ اُٹھائیں اور بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے قرآن وحدیث کی کتابیں سامنے رکھ دی جائیں حقیقت یہ ہے کہ روحانی منازل طے کرانے کے لئے ایسے رہبرِ کامل کی ضرورت ہوتی ہے کہ باطنی آنکھوں سے قلب کی بیماریوں پر نظر ڈال کر ان کا علاج کرے۔ علمائے ظاہر اور اولیاء کرام کے طریقۂ ہدایت میں یہی فرق ہے کہ علمائے ظاہر صرف پانی یا شربت کی خوبیوں پہ لمبی لمبی تقاریر کرنا جانتے ہیں پیاسے کے حلق میں پانی نہیں ڈال سکتے۔ اس کے برعکس اولیائے کرام صرف شربت پر تقریر نہیں کرتے بلکہ پیاسے کے حلق میں شربت بھی ڈال دیتے ہیں کیونکہ پیاسے کی پیاس صرف شربت پر تقریر سُن کر نہیں بجھتی وہ صاحب بصیرت ہوتے ہیں قلب کی بیماریوں پر نظر ڈال کر پہلے تشخیصِ امراض کرتے ہیں اور پھر علاج کرتے ہیں۔ اور قلب پر نظر ڈال کر اس کی حالت کو دیکھ لینا احادیث سے ثابت ہے آں حضرتؐ فرماتے ہیں اِتَّقُوْا فِرَاسَتَ الْمُؤْمِنِ اِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ ط (مومن کی باطنی بصیرت سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے) نیز حدیث قدسی بِیْ یُبْصِرُ وَبِیْ یَسْمَعُ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب مومن خدا کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اللہ کے کانوں سے سُنتا ہے تو کیا کچھ دیکھ اور سُن نہیں سکتا۔ کشف و کرامات تو اسلام کی مسلمہ باتوں میں سے ہے۔ ان کا کسی نے انکار نہیں کیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ شیخ کامل کی طریقت میں از حد ضرورت ہے کیونکہ وہ ذاتی تجربہ

کی بنا پر سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کی تمام منازل سے آگاہ ہوتا ہے اور مرید کا ہاتھ پکڑ کر دشوار گذار گھاٹیوں اور وادیوں سے پار کراتا ہے کیونکہ دین کا راستہ جہاں آسان ہے وہاں ڈاکو اور راہزن بھی پڑتے ہیں کیونکہ سالکین راہِ حقیقت کے پاس بڑی دولت ہوتی ہے ایسی دولت کہ دنیا کی کوئی دولت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور شیطان اس دولت کو دیکھ کر حسد کرتا ہے اور راہزنی پر اُتر آتا ہے۔ یہ فقط باتیں نہیں ہیں آپ اس کوچہ میں آکر خود دیکھ سکتے ہیں کہ مشائخ عظام جو آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے ورثاء اور خلفاء ہیں کس طرح نبی علیہ السلام کی طرح باطنی توجہ سے مریدین کا تزکیۂ نفس کرتے ہیں اور باطنی فیض سے قلوب کو بھر دیتے ہیں۔ یہ کام اہل مزارات بھی کرسکتے ہیں جس طرح آج بھی آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لوگوں کے حالات اپنی باطنی آنکھوں سے معلوم کرکے ان کی اعانت فرماتے رہتے ہیں اسی طرح باقی اہلِ مزار بھی یہ کام کرسکتے ہیں کیونکہ وہ بھی نائبِ نبی ہوتے ہیں۔ اہلِ مزار سے فیضِ روحانی حاصل کرنے کا نام اویسی نسبت ہے۔ تاریخ شاہد ہے حضرت غوث الاعظمؒ کی روحانی تربیت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کردی تھی لیکن آگے سلسلہ چلانے کے لئے آپ نے فرمایا کہ ظاہری شیخ کی ضرورت ہے اور جاکر فلاں شیخ کی بیعت کرلو۔

اس سلسلے میں غیر مقلدین کے امام حضرت امام ابنِ تیمیہ کے شاگردِ رشید حافظ ابنِ قیمؒ کی کتاب "کتاب الروح" دیکھنے کے قابل ہے اس میں وہ پکے صوفی نظر آتے ہیں۔ کتاب مذکور میں انھوں نے بے شمار ایسے واقعات نقل کئے ہیں جن کی رُو سے آنحضرتؐ کا اپنے مزار مبارک میں بیٹھے ہوئے امت کے لوگوں کے حالات سے واقف ہونا اور ان کی اصلاح فرمانا ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حافظ ابنِ قیمؒ نے حضرت شیخ اسماعیلؒ ہروی کی مشہور کتاب "سیر السالکین" کی شرح لکھی ہے جس کا نام "مدارج السالکین" ہے۔ یہ کتاب یعنی یہ شرح علوم تصوف و روحانیت میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ خود امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سلوک کی تمام منازل مثلاً فنا فی اللہ بقا باللہ۔ سکر و صحو وغیرہ کے قائل تھے کاش کہ

آج کل کے غیر مقلد حضرات امام ابن تیمیہ اور حافظ ابنِ قیم جیسے تصوف کے حامیوں کی تقلید کرتے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اکابرینِ دین کے آج کل کے معتقدین ان کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں جس طرح اہلِ حدیث اہلِ حدیث نہیں رہے اسی طرح نہ آج کل دیوبندی حقیقی معنوں میں دیوبندی ہیں نہ آجکل کے بریلوی حقیقی معنوں میں بریلوی ہیں۔ اکابر دیوبند خالص صوفی تھے ان کی کتابوں کا ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اکابر بریلوی بھی صوفی تھے۔ لیکن نہ آج کل کے دیوبندی صوفی ہیں نہ بریلوی صوفی ہیں اگر کچھ ہیں تو ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور گالی گلوچ سے ایک دوسرے کی تواضع کرنے اور روپیہ پیسہ کمانے میں ماہرِ فن ہیں۔

علاماتِ شیخِ کامل

ضرورتِ شیخ سمجھ لینے کے بعد یہ جاننا ضروری ہے کہ شیخِ کامل کون ہوتا ہے اور اس کی علامات کیا ہیں۔ بزرگانِ دین نے شیخِ کامل کی مختصراً یہ چار علامات لکھی ہیں اول وہ متبع شریعت ہوں اور کسی شیخ کامل کی صحبت میں رہ کر سلوک تمام کرکے منازلِ قرب، وصال فنا فی اللہ اور بقا طے کرچکے ہوں۔ دوم جب اُن کی صحبت میں بیٹھو تو کم ازکم اُسی وقت کے لئے دل میں خدا تعالیٰ کی طرف رجوع پیدا ہو۔ سوم ان کے مریدین کو دیکھنا چاہئے کہ ان میں کیا اثر ہوا ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ان کی نسبت لازم ہے یا متعدی یعنی وہ صرف اپنے لئے کامل ہے یا دوسروں کی ہدایت کا کام بھی اُس کے سپرد ہوا۔ شیخ کے لئے تمام علومِ اسلامیہ پر حاوی ہونا ضروری نہیں بلکہ فرائض، سنن، نوافل عبادات کی بجاآوری اور محرمات یعنی حرام کاموں سے اجتناب اور جائز و ناجائز امور میں تمیز کرنے کی قابلیت کافی ہے۔ ہاں یہ بات ضروری ہے کہ سالکین کے قلبی امراض اور ان کے علاج سے واقف ہو اور ریاضت و مجاہدہ کے طریقے ہر شخص کی استعداد کے مطابق جانتا ہو اور عقل مند ہو تاکہ مریدین کے مزاج اور اُن کی برائیوں کو معلوم کرسکے اور راہِ سلوک کے تمام ایسے علوم و معارف میں مہارتِ تامہ رکھتا ہو جن کی مریدین کو ضرورت پڑتی ہے۔ شیخ کے لئے مقامات و منازل تلوینات اور تکوینات

سے گزر کر مرتبۂ فنار الفنار اور بقار البقار تک پہنچنا بھی ضروری ہے تاکہ سالکین کی راہنمائی کر سکے۔ شیخ کی شرائط میں سے یہ بھی ہیں کہ وہ کریم، رحیم، صابر اور حلیم ہو۔ سخت رُو، ترش مزاج، تلخ کلام، اور بدخلق نہ ہو۔ دنیا پرست، زینت کا طالب اور حریص نہ ہو۔

سلوک الی اللہ میں عشق کا مقام

فضل اللہ اور ضرورتِ شیخ کے بعد طریقت میں عشق بے حد ضروری ہے عشق دین اسلام کی اصل ہے اس کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مومن لوگ شدت سے اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (شدت سے محبت کرنے والے) نیز فرمایا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اے نبیؐ کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا (نبی کا) اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا) جس سے اللہ محبت کرے وہ اللہ کا محبوب ہوتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اتباعِ رسولؐ اللہ سے مقام محبوبیت حاصل ہوتا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا مَحَبَّةَ لَهٗ (جسے محبت نہیں اُسے ایمان نہیں) آپ نے یہ جملہ تین دفعہ دہرایا۔ پس اس کوچہ میں عشق کے بغیر کام نہیں چلتا۔ عشق اسلام کی جان اور طریقت کی روح ہے عشق باعثِ تخلیق کائنات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (میں ایک مخفی خزانہ تھا مجھے اس بات کی محبت ہوئی کہ مجھے لوگ دیکھیں اس لئے میں نے خلقت کو پیدا کیا) اس سے ظاہر ہے کہ کائنات کی بنیاد عشق پر ہے ؎

از تقاضائے حبّ جلوہ پری
اندر آمد حصارِ شیشہ پری

(اپنے حسن و جمال کا جلوہ دکھانے کے لئے پری آئینہ میں جھانک کر اس کے اندر گرفتار ہو گئی)

بضمیرت آرمیدم تو بجوشِ خود نمائی
زکنارِ بر فگندی دُرِ آفتاب خود را

(میں (انسان) تیرے (حق کے) دل میں بسر کر رہا تھا۔ تو نے خودنمائی کے جوش میں آکر اپنے تابندہ گوہر کو دل سے نکال کر باہر پھینک دیا۔)

عشق ہی احسانات کو دیکھ کر عارف رومی چلا اُٹھے : ؎

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

(خوش رہو اے میرے عشق، اے میرے جنوں، اے میری تمام بیماریوں کی دوا)

شیخ فریدالدین عطارؒ عشق کی چیت یوں کرتے ہیں ؎

درد حاصل کُن کہ درماں درد تُست

در دو عالم داروئے جاں درد تُست

(درد حاصل کر کیونکہ یہ تیرا درماں یعنی دوا ہے۔ دونوں جہانوں میں درد ہی جاں کی دوا ہے)

کفر کافر را و دیں دیندار را

ذرۂ دردت دلے عطار را

(کافر کو کفر دے اور دیندار کو دین دے۔ مجھ غریب کو تیرے درد کا ایک ذرہ چاہیئے)

ملتِ عشق از ہمہ دینہا جدا است

عاشقاں را ملت و مذہب خدا است

(مذہبِ عشق تمام مذاہب سے علیحدہ ہے عاشقوں کا مذہب و ملت خدا ہے۔)

کسی نے خوب کہا ہے ؎

گر عشق نہ بودے و غمِ عشق نہ بودے

ایں سخنِ نغز کہ گفتے کہ شُنیدے

(اگر عشق ہوتا اور غمِ عشق نہ ہوتا تو یہ کھری باتیں کون کہتا اور کون سُنتا)

علامہ اقبالؒ بھی عشق کی قدر جانتے ہیں فرمایا ؎

ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد ٭ عشق فریب مے دہد جانِ اُمیدوار را

(خواہش دیدار نے بت گری کی رسم شروع کی۔ یہ عشق طالب دیدار کو کئی فریب دیتا ہے)

تیشہ اگر بسنگ زد ایں چہ مقام گفتگو است
عشق بدوش مے کشد ایں ہمہ کوہسار را

(فرہاد نے شیریں کے لئے دودھ کی نہر نکالی اور پتھر توڑے یہ کونسی بڑی بات ہے
عشق تو اس سارے سلسلۂ کوہ کو اٹھاکر کندھوں پر رکھ لیتا ہے)

دنیا کا ہر شخص اپنی جگہ پر عاشق ہے کوئی کسی چیز کا عاشق ہے کوئی کسی چیز کا ؎

قبلۂ شاہاں بود تاج و گہر ٭ قبلۂ ارباب دنیا سیم وزر

(بادشاہ تخت و تاج کے عاشق ہیں دنیا دار سونا چاندی کے)

قبلۂ صورت پرستاں آب و گل — قبلۂ معنی شناساں جان و دل
قبلۂ زہاد محراب قبول — قبلۂ بدسیرتاں کار فضول
قبلۂ تن پروراں خواب و خورش — قبلۂ انساں بدانش پرورش
قبلۂ عاشق وصال بے زوال — قبلۂ عارف جمال ذوالجلال

عرفی فرماتے ہیں ؎

فقیہاں دفترے را مے پرستند — حرم جویاں درے را مے پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد — کہ یاراں دیگرے را مے پرستند

حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی فرماتے ہیں ع

عشق میں تیرے کوہ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو

ایک صاحب فرماتے ہیں ؎

دل را بہ آتش غم جانانہ سوختیم — قندیل کعبہ را بہ صنم خانہ سوختیم
زاں آرزو کہ جلوہ کند شعلہ پیکرے — شبہا چراغ کعبہ و بتخانہ سوختیم

سعدی فرماتے ہیں ؎

من چہ در پائے تو ریزم کہ سزائے تو بود ٭ سر نہ چیز نیست کہ شائستۂ پائے تو بود

(میں تیرے پاؤں میں کیا نذر کروں جو تیرے قابل ہو یہ سر تو اس قابل نہیں کہ تیرے پاؤں میں ڈالا جا سکے)

امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

درد ہا دادی و درمانی ہنوز
جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز

(تونے بے شمار درد دئے ہیں پھر بھی تم میری دوا ہو۔ میری جان نکال لی ہے پھر جان کے اندر ہو)

نیز فرمایا ؎

ہر دم منم فتادہ بگرد سرائے تو ہر روز آہ و نالہ کنم از برائے تو
روزے کہ ذرہ ذرہ شود استخوانِ من باشد ہنوز در دلِ رشیم ہوائے تو

ایک صاحب فرماتے ہیں ؎

آتش رخسارِ گل خرمن بلبل لسوخت
چہرۂ خنداں شمع آفت پروانہ شد

بہلول دانا فرماتے ہیں ؎

روشن از عکس جمالش عالم امکاں ما
یک نگاہِ نازِ جاناں قیمتِ ایمان ما

حضرت خواجہ غلام فرید فرماتے ہیں ؎

میڈا عشق وی توں میڈا یار وی توں میڈا دین وی توں ایمان دی توں
میڈا جسم وی توں میڈا روح وی توں میڈا قلب وی توں جند جان وی توں
میڈا قبلہ کعبہ مسجد مندر دیر دوارہ میڈا مصحف تے قرآن دی توں
میڈا دھرم وی توں میڈا ابھرم وی توں میڈا شرم وی توں میڈا شان وی توں
جے یار فرید قبول کرے سرکار دی توں سلطان وی توں

نا تاں کہتر کمتر ادنے
لا شے لا امکان دی توں

سلوک الی اللہ کیا ہے مقام قرب حاصل کرنے کے لئے شریعت کی پابندی فضل اللہ کی ضرورت، شیخ کی ضرورت اور عشق کی ضرورت سمجھ لینے کے بعد آیئے یہ دیکھتے ہیں کہ یہ سفر کیسے طے کیا جاتا ہے۔ سلوک کے لفظی معنی راہ کے ہیں۔ اور سالک راہ پر چلنے والے کو کہتے ہیں۔ لیکن علم روحانیت کی اصطلاح میں سلوک سے وہ راستہ مراد ہے جو بطریق کشف طے کیا جاتا ہے نہ بطریق استدلال۔

طالبانِ راہ طریقت کی طبائع اور استعداد میں چونکہ اختلاف ہوتا ہے۔ اللہ تک پہنچنے کے بے شمار طریق ہیں اس لئے عارفین کا قول ہے کہ اَلطُّرُقُ اِلَی اللّٰہِ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ (یعنی اللہ تک پہنچنے کے راستے اتنے ہیں جتنے کہ مخلوقات کے سانس)

لیکن تین طریقے عام اور اقرب (قریب تر) ہیں۔

طریق اخیار صالح لوگوں کا طریقہ جو کثرتِ صوم وصلواۃ ، تلاوت، حج و زکوٰۃ سے طے ہوتا ہے۔

طریقِ مجاہدات یعنی اخلاقِ ذمیمہ کو جد وجہد، محنت و کوشش اور ریاضتِ شاقہ کے ذریعہ حسنات یعنی اخلاقِ حمیدہ میں تبدیل کر کے عالم بالا سے مناسبت پیدا کی جائے۔

طریقِ شطاریہ اس طریق میں ریاضت سے گریز، صحبتِ خلق سے پرہیز، ماسوی اللہ سے بیزاری اور درد و اشتیاق، ذوق و شوق اور ذکر و فکر کے علاوہ کسی چیز سے سروکار نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ اقرب اور زیادہ قوی ہے۔ اس طریق میں مجاہدات کے ذریعہ جنگل کے ہر درخت کو بیخ سے نکالنے کی بجائے جنگل میں عشق کی آگ لگا دی جاتی ہے جس سے غیر اللہ جل کر راکھ بن جاتا ہے۔

لطائفِ ستّہ

یاد رہے کہ انسان کے جسم میں چھ لطائف یا روحانی مرکز ہیں جن کا نام لطائف ستہ ہے۔ پہلے لطیفہ کا نام لطیفۂ نفس ہے جس کا مقام ناف ہے اور اس کے نور کا رنگ زرد ہے دوسرا لطیفۂ قلب جس کا مقام بایاں پہلو ہے۔ اس کے نور کا رنگ سُرخ ہے۔ تیسرا لطیفۂ روح ہے جس کا مقام دایاں پہلو ہے اس کے نور کا رنگ سبز ہے۔ چوتھا لطیفۂ سرّ ہے جس کا مقام لطیفۂ قلب اور روح کے درمیان وسطِ سینہ میں ہے۔ پانچواں لطیفۂ خفی ہے جس کا مقام وسطِ پیشانی ہے اور اس کے نور کا رنگ نیلگوں ہے۔ چھٹے لطیفہ کا نام لطیفۂ اخفیٰ ہے اس کا مقام امّ الدماغ یعنی سر کی چوٹی ہے اس کے نور کا رنگ سیاہ ہے حضراتِ نقشبندیہ کے ہاں لطائف کے ناموں میں ذرا فرق ہے حقیقت ایک ہے۔

اوراد، وظائف، اذکار، مشاغل، مراقبات

روزمرّہ نماز روزہ کے علاوہ مشائخ سلاسل نے کئی طرح کے اوراد، وظائف، اذکار، مشاغل اور مراقبات تجویز کئے ہیں جن کی ضربیں قلب اور دیگر لطائف پر ماری جاتی ہیں جس سے ان لطائف میں ذکر جاری ہوتا ہے۔ جب ان میں ذکر جاری ہوا تو سمجھو کہ سارا گھر روشن ہوگیا۔ بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس قسم کے اوراد و وظائف اور اذکار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کب تھے۔ جواب یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں روحانی قوت اس زور کی تھی آپ کے سامنے بیٹھنے، کلام کرنے اور آپ کی باطنی توجہ سے صحابۂ کرام کے کئی منازل طے ہوجاتے تھے لیکن جوں جوں آں حضرتؐ کے زمانہ سے بُعد ہوتا گیا لوگوں کے قلوب پر زنگ زیادہ سے زیادہ چڑھتا گیا جسے دور کرنے اور مانجھنے کی خاطر بعد میں آنے والے مشائخ نے روحانی مشقیں تیار کیں اور اللہ تعالےٰ کے مختلف اسماء حسنہ کی مختلف لطائف پر ضربیں مارنے سے وہ کمی دُور ہوگئی۔ نیز معترضین کو جاننا چاہیے کہ آخر یہ اسما جن کی قلب اور دیگر لطائف پر ضربیں لگائی جاتی ہیں وہ بھی تو اللہ تعالےٰ کے پاک نام ہیں۔ اللہ کے ناموں پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے۔ نیز قرآن مجید میں کثرت سے اللہ

کاذکرکرنے کی جا بجا تاکید کی گئی ہے۔ اور یہ ذکر اسماء الٰہیہ کے دہرانے کا نام ہے۔ ورنہ ذکر کیسے ہو سکتا ہے۔ اعتراض کی خاطر اعتراض کرنے سے کیا فائدہ۔

ذکر نفی اثبات

سب اذکار سے زیادہ ذکر نفی ثبات لا اِلٰہ اِلا اللہ کا ورد کیا جاتا ہے اور معترض کو جاننا چاہیئے کہ یہ ذکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رض کو خلوت میں تعلیم فرمایا اور انھوں نے حضرت حسن بصری کو اور انھوں نے اپنے مریدوں کو بتایا۔ حضرت شداد بن اوس رض اور حضرت عبادہ بن صامت رض روایت کرتے ہیں کہ ہم حضور اقدس کی خدمت میں بیٹھے تھے آپ نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی غریب (اجنبی جس سے اہل کتاب مراد ہے) ہے۔ ہم نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا۔ دروازہ بند کرلو۔ جب دروازہ بند کیا تو آپ نے فرمایا اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھاؤ اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہو۔ ہم نے اسی طرح کیا۔ کچھ دیر کے بعد آپ نے ہاتھ نیچے کئے اور فرمایا الحمدُ لِلّٰہِ اے اللہ تو نے مجھے کلمہ کے لئے مبعوث فرمایا تھا اور اس کلمہ کا حکم فرمایا تھا اور اس کلمہ پر جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ آپ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتے اس کے بعد فرمایا کہ تمہیں خوش خبری ہو اللہ نے تمہیں بخش دیا۔" اسی طرح صحابہ تابعین اور تبع تابعین اور اُن کے بعد ایک شیخ دوسرے شیخ کو یہ ذکر تلقین کرتے آئے۔ اس حدیث سے ذکر نفی اثبات اور خلوت کی تعلیم ثابت ہوتی ہے

ذکرِ اسمِ ذات

یہ ذکر اسم اللہ کے ورد کا نام ہے اس سے اسم پاک کی جب مسلسل ضربیں قلب پر شدت سے تصور میں لگائی جاتی ہیں تو قلب زندہ ہو جاتا ہے اور اس کے اندر ذکرِ اللہ جاری ہو جاتا ہے بلکہ اس کے ذریعے سارے جسم میں ذکر جاری ہو جاتا ہے اس کی پہچان یہ ہے کہ جب کسی عضو کو مثلاً ہاتھ، بازو، گھٹنے وغیرہ کو ڈھیلا چھوڑ دیا جائے اُس میں حرکت ہوتی ہے اور وہ حرکت دل کی حرکت کے ساتھ چلتی ہے یہ ذکر عام طور پر دن میں چوبیس ہزار بار کیا جاتا ہے لیکن شروع میں کم تعداد سے کیا جاتا ہے مثلاً ایک ہزار سے شروع کر کے رفتہ رفتہ چوبیس ہزار تک پہنچایا جاتا ہے۔ بعض

مشائخ دس ہزار یا بارہ ہزار کافی سمجھتے ہیں۔ چوبیس ہزار میں یہ حکمت ہے کہ انسان چوبیس گھنٹوں میں چوبیس ہزار سانس لیتا ہے۔ پس چوبیس ہزار دفعہ ذکر کرنے سے ہر سانس کے ساتھ ذکرِ الٰہی قائم ہو جاتا ہے۔

مشاغل زبان سے جو اللہ تعالےٰ کے اسماء دہراتے ہیں اسے ذکرِ لسانی یا ذکرِ جلی کہتے ہیں لیکن خاموشی کے ساتھ تصور میں جو ذکر کیا جاتا ہے اُسے ذکرِ خفی کہتے ہیں۔ ذکرِ خفی کو مشاغل بھی کہتے ہیں۔ اس کی کئی قسمیں ہیں :-

۱۔ ذکرِ قلبی۔ یہ ذکر خاموشی سے تصور میں لطیفۂ قلب میں کیا جاتا ہے اس کا تعلق عالمِ مثال سے ہے۔

۲۔ ذکرِ روحی۔ یہ ذکر لطیفۂ روح میں کیا جاتا ہے اس کا تعلق عالمِ ارواح یا عالمِ ملکوت سے ہے۔

۳۔ ذکرِ سرّی۔ یہ ذکر لطیفۂ سرّ میں کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق عالمِ جبروت سے ہے یعنی عالمِ صفاتِ الٰہی۔

۴۔ ذکرِ خفی۔ یہ ذکر لطیفۂ خفی میں کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق عالمِ لاہوت (ذات) سے ہے۔

۵۔ ذکرِ اخفیٰ۔ یہ ذکر لطیفۂ اخفیٰ میں کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق عالمِ ہاھوت (ذات بحت) سے ہے۔

لطائف خفی اور اخفیٰ میں ذکر جب جاری ہوتا ہے تو یہ علاؤ وصال اور فنا فی اللہ ہے یہ بڑی چیز ہے اس کی مداومت لازمی ہے۔

مراقبات مراقبہ کے معنی ہیں انتظار کرنا۔ یعنی دل میں کوئی خیال مثلاً اللہ تعالےٰ کے موجود ہونے کا یا اللہ کے قریب ہونے کا یا اللہ کے قدیم ہونے کا یا اللہ کے بسیط ہونے کا خیال دل میں جما کر اللہ کی طرف سے انوار کا انتظار کیا جاتا ہے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی کتاب ضیاء القلوب اور شاہ ولی اللہؒ دہلوی کی کتاب

قول الجمیل میں اذکار و مشاغل و مراقبات تفصیل سے درج ہیں۔

ان اوراد۔ اذکار۔ مشاغل اور مراقبات کی کثرت سے لطائف میں ذکر اللہ جاری ہوتا ہے۔ اور روح میں جلا پیدا ہوتی ہے جس سے وہ قوت پکڑ کر ذات حق کی جانب پرواز کرتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ پرواز خارج میں نہیں بلکہ باطن میں ہوتی ہے بُعد یا دُوری کی جانب نہیں قرب کی جانب ہوتی ہے اس لئے کہ انسان کا قلب عرش الٰہی ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ نیز لَا یَسْعَنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَائِیْ وَلٰکِنْ یَسْعَنِیْ قَلْبُ عَبْدِیَ الْمُؤْمِنُ۔ اللہ تعالیٰ نہ آسمان میں سما سکتا ہے نہ زمین میں لیکن عبد مومن کے قلب میں سما سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے ترقی کی پرواز اندر کی طرف ہوتی ہے۔

منازل سلوک شروع سے لے کر آخر تک سالک راہِ حقیقت جن روحانی منازل سے گزرتا ہے اس کا ایک خاکہ ذیل کے دائرہ سے اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔
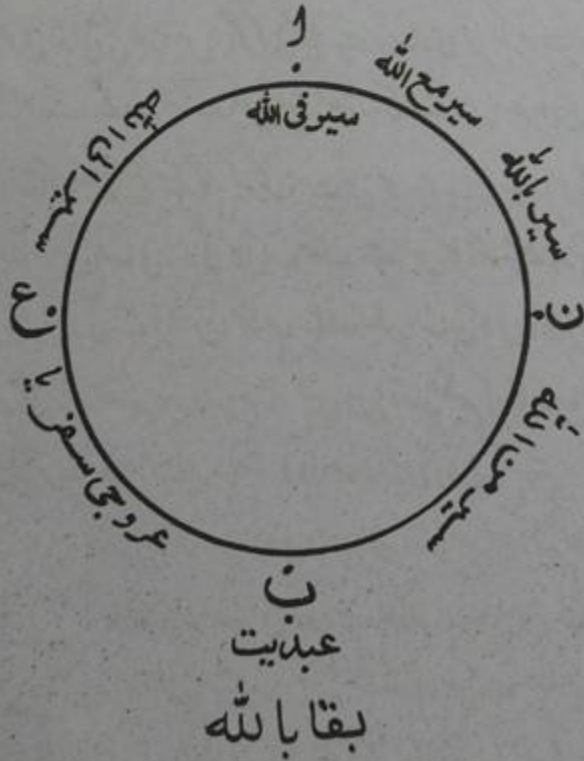
سیر الی اللہ اس دائرہ میں نقطہ ب سے مبتدی کے روحانی سفر کا آغاز ہوتا ہے اور ب ع کے راستے مقامِ ا پر پہنچ جاتا ہے۔ ب سے ع اور پھر ا تک کے سفر کو سیرِ عروجی یا سیر الی اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ا مقامِ احدیت اور ذات بحت ہے یعنی خالص ذات بلا صفات PURE ESSENCE اسے ذاتِ لاتعین بھی کہتے ہیں

فنا فی اللہ یہاں پہنچ کر سالک ذاتِ حق میں واصل اور فنا ہو جاتا ہے یہ نہ اتحاد ہے نہ حلول کیونکہ اتحاد اور حلول دو ہستیوں کے تصور سے واقع ہوتا ہے۔ لیکن صوفیا کے نزدیک ہستی یا وجود صرف ایک ہے اور وہ ہے ہستیِ باری تعالیٰ۔ باقی سب وجود اضافی۔ اعتباری اور وہمی RELATIVE ہیں۔ اِس لئے یہاں فنا کا لفظ سب سے زیادہ موزوں ہے کیونکہ انسان کی ہستیٔ موہوم ذاتِ حق میں گم ہو جاتی ہے اس لئے اس مقام کو فنا فی اللہ کہتے ہیں۔ اسے سیر فی اللہ بھی کہتے ہیں۔ چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ کی حد نہیں۔ اگر کوئی چاہے تو ساری عمر بلکہ موت کے بعد قیامت تک اور پھر قیامت کے بعد بہشت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سفرِ عروجی میں رہ سکتا ہے اور پھر بھی انتہا کو نہیں پہنچ سکے گا۔ کیونکہ ذاتِ حق بحرِ بے پایاں ہے اس کا کوئی کنارہ نہیں۔ لیکن اسلام میں انسانی زندگی کا ایک مقصد ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یعنی دوبارہ دوئی میں آکر زندگی کے فرائض انجام دینا اور بطورِ انسانِ کامل دنیا میں خلافتِ الٰہیہ اور نیابتِ ربانی کے منصب پر فائز ہونا۔ پس اس مقصدِ عظیم کی خاطر سالک کو ذاتِ حق میں کافی اندر جا کر پھر مقامِ ب پر براستہ ا ن ب واپس آنا پڑتا ہے۔

سیر من اللہ اس سفر کو سفرِ نزدلی یا سیر من اللہ۔ سیر مع اللہ اور سیر باللہ کہتے ہیں۔ مقامِ ا پر بمصداق حدیث تخلقوا باخلاق اللہ اور بیُ یَسْمَعُ اور بی یَبْصُرُ صفاتِ الٰہیہ کے ساتھ متصف ہوئے بغیر وہ نیابتِ الٰہیہ کے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے اُسے بادشاہ کے اختیارات

بھی تفویض ہوتے ہیں یہ قاعدہ کلیہ ہے دنیاوی بادشاہ بھی اپنے عاملوں اور گورنروں کو اپنے اختیارات تفویض کرتے ہیں۔

بقا باللہ غرضیکہ صفاتِ الٰہی سے متصف ہو کر جب سالک مقامِ ب پر مقامِ دوئی میں واپس آتا ہے تو اس وقت وہ انسانِ کامل ہوتا ہے اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جانشین اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اُسے دیگر تکوینی فرائض کے علاوہ ہدایتِ خلق پر مامور کیا جاتا ہے۔ مقامِ ب عبدیت کا مقام ہے اِسے بقا باللہ عبودیت اور فرق بعد جمع بھی کہتے ہیں۔ جاننا چاہیئے کہ فنا فی اللہ اور بقا باللہ میں مستقل طور پر کوئی نہیں رہتا بلکہ جب چاہیں اوپر چلے جاتے ہیں اور نیچے واپس آجاتے ہیں۔

مقام بقا باللہ کی شان مقام بقا باللہ کی بڑی شان ہے۔ یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی وساطت سے آپ کی اُمت کے اکابر کا مقام ہے۔ پہلی امتوں میں فنا فی اللہ ہی آخری مقام تھا لیکن قرآنِ عظیم کی آیۂ پاک اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کے بمصداق امتِ محمدؐ کے لئے بلند ترین مقام کی نشان دہی کردی گئی کیونکہ آں حضرتؐ خاتم الانبیاء ہیں آپ کی امت کے لئے عروج کی آخری منزل البقا باللہ مقرر ہوئی یہ وہ جامعیت ہے جو انبیاء علیہم السلام ماسبق میں نہ تھی۔ آپ سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام میں ہر زمانے کی خصوصیات کے مطابق جزوی کمالات تھے لیکن نبی آخر الزمان کے لئے کمالات کی آخری منزل یہی بقاء باللہ قرار پائی۔ اب جو لوگ صوفیائے اسلام پر غیر مذاہب سے خوشہ چینی کے الزام لگاتے ہیں اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ بقا باللہ کی کیا شان ہے اولیائے امتِ محمدؐ کو اللہ کے فضل و کرم سے وہ بلند ترین مقامات حاصل ہوئے کہ جن کی گرد تک عیسائی ہندو، بدھ اور یونان کے روحانی لوگ نہ پہنچے نہ پہنچ سکتے ہیں کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سی جامعیت کسی امت میں نہیں ہے۔ اس لئے جو لوگ یہ الزام لگاتے ہیں وہ توہمات اور شکوک کی دنیا میں رہتے ہیں حقائق سے بالکل بے بہرہ ہیں اور حقائق

سے ان کو کس طرح آگاہی ہو سکتی ہے۔ حقائق سے آگاہی تو صرف ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ہرگز ہرگز کوئی شخص حقائق سے آگاہ نہیں ہو سکتا محض قیاس آرائی کی دُنیا میں زندگی ضائع کرتا ہے۔

اب آیئے ذرا بقا باللہ کی شان اور واصلینِ ذاتِ حق کے کمالات کے متعلق مختصر باتیں سُن لیں۔ مقربانِ بارگاہِ قدس حق تعالےٰ کے عاشق بھی ہوتے ہیں اور معشوق بھی۔ محب بھی ہوتے ہیں اور محبوب بھی۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ (جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اُس کا ہو جاتا ہے) اب آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ جس شخص کا اللہ ہو جائے سب کچھ اُس کا ہے۔ اگر کوئی وزیر یا صدرِ مملکت آپ کا ہو جائے اور آپ جو چاہیں وہ پُورا کرے تو آپ کی خوشی اور کامیابی کی کوئی انتہا نہ ہو گی۔ لیکن جس خوش نصیب آدمی کا اللہ اپنا ہو جائے تو اس کی خوشی اور کامیابی کے متعلق آپ کیا کہیں گے۔ بس ہوتا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی پوری چابیاں اُن کے حوالے کر دیتے ہیں کہ جو چاہو کرو۔ کیونکہ وہ نائبِ حق بھی ہے اور اللہ کا محبوب بھی۔ لیکن کمالِ ادب سے مردِ کامل اللہ کی دی ہوئی ساری نعمت پھر اللہ کے قدموں میں ڈال کر عبدِ محکوم اور غلام بن جاتا ہے کیونکہ اسی میں اُس کو زیادہ مزہ آتا ہے۔

لذاتِ قرب

آپ جانتے ہیں کہ مذہب کی طرف لوگ اس لئے نہیں آتے کہ وہ دنیاوی زندگی کے مزے مثلاً خورد و نوش، شراب و کباب اور چنگ و رباب نہیں چھوڑ سکتے لیکن مقربانِ بارگاہِ حق تعالےٰ حق تعالےٰ کے قرب و وصال میں اس قسم کی تمام لذات بدرجۂ اعلیٰ واتم حاصل کرتے ہیں بلکہ شرابِ وصل اور محبوبِ حقیقی کے جو جلوے اس کوچہ میں ہیں اس کا کروڑواں حصہ بھی محبوبانِ مجازی اور شرابِ مادی سے حاصل نہیں ہوتا۔ مادی شراب کا یہ حال ہے کہ پی پی کر لوگ اس سے تنگ آ گئے ہیں۔ صحت خراب کرتی ہے دماغ پریشان کرتی ہے۔ بیش بہا رقم صرف ہوتی ہے لیکن اس کا اثر کیا ہے نہایت عارضی اور نقصان دہ ہے لیکن شرابِ وصل کے کیا کہنے ایک پیالہ نہیں دو نہیں تین نہیں، صراحی

اور خم پی جاؤ۔ ندی نالے نہیں دریا نوش کر لو لیکن پھر بھی آپ پُر جوش ہیں، شاداب ہیں، جوش و خروش میں وصلِ حبیب اور اس کے حسن و جمال کے مزے اُڑا رہے ہیں - آپ جانتے ہیں کہ اس کا حسن و جمال کیا ہے۔ محبوبانِ مجازی اس حسنِ ازلی کا ادنیٰ کرشمہ ہیں - محبوبانِ مجازی کے وصل کی ایک انتہا ہے جہاں پہنچ کر آدمی بدمزہ ہو جاتا ہے لیکن محبوبِ حقیقی کے وصال کی کوئی انتہا نہیں۔ آپ کروڑوں برس وصل میں رہیں تب بھی پیٹ نہیں بھرتا۔ کیونکہ حسن و جمال کی کوئی حد نہیں ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ دوست کے حُسن و جمال کی کوئی حد ہے نہ سعدی کی مدحت کی حد ہے ہوتا یہ ہے کہ عاشق شراب وصل پی پی کر ختم ہو جاتا ہے لیکن دریا چلتا رہتا ہے)

اولیاء اللہ کے عالی ظرف

اس کے حسن و جمال کا یہ عالم ہے کہ جس قدر آپ وصل میں جائیں اس سے اوپر قرب و وصال کی اور منزل ہے اس سے اوپر جائیں تو اوپر اور منزل ہے غرضکہ منازل کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب۔ اور عاشق کی محویت کا یہ عالم ہے نہ کوئی قلم لکھ سکتا ہے نہ زبان ادا کر سکتی ہے۔ وصلِ حبیب میں سالک اس قدر سرشار مست اور بے خود ہو جاتا ہے کہ اُسے آگ میں ڈال دیں یا سر پر آرہ چلا دیں تو پتہ نہیں چلے گا لیکن یہ حضرات اس قدر بلند ہمت اور عالی ظرف ہوتے ہیں کہ دریا نوش کر جاتے ہیں اور بدمست نہیں ہوتے۔ حلاج جیسے اکا دکا لوگ بدمست ہوئے تو سزا بھی پائی۔ اُمتِ محمدیہ میں ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ دوسرے مذاہب میں ان کی کثرت ہوتی تھی اور وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے۔ اب تو غیر مسلموں پر سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ سرورِ کائنات جیسی بڑی حقیقت کا انکار کر کے وہ ہر قسم کی دولت سے محروم ہو گئے ہیں۔ یہ دولت تو صرف کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی بدولت حاصل ہوتی ہے اس کے بغیر جتنے دعوے ہوں سب باطل، مکر و فریب ہیں۔

کشف و کرامات کوئی چیز نہیں | ہاں یہ بات ضرور ہے کہ مجاہدات شاقہ کی وجہ سے ان لوگوں کی روح میں ذرا سی لطافت آجاتی ہے جس سے وہ نہایت معمولی قسم کی کرامات دکھا سکتے ہیں۔ اس کو وہ لوگ بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں لیکن اولیاء اسلام کے نزدیک تو کشف و کرامات کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ ا سے وہ بچوں کا کھیل اور بھان متی کا تماشا اور بازی گری کہتے ہیں۔ وہ کشف و کرامات میں مشغول ہونے سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ اس سے مراتب میں بھی کمی واقع ہوتی ہے اور آگے زیادہ ترقی بھی نہیں ہوتی۔ اولیائے اسلام کے نزدیک قرب الی اللہ۔ وصل حق۔ فنافی اللہ اور فناء الفنا اور بقاء البقا حقیقی مقاصد ہیں کشف و کرامات بہت نیچے کی چیز ہے۔

بادشاہ جہانگیر کا واقعہ | ایک دفعہ جہانگیر بادشاہ حضرت میاں میر لاہوری رح کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوا کہ آپ اس کو یہ بتا دیں کہ جس مہم پر وہ جا رہا ہے اس میں فتح ہو گی یا شکست۔ لیکن آپ نے ٹال دیا۔ بادشاہ مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا۔ دروازے پر شیخ کا ایک مرید بیٹھا تھا' پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ اس نے کہا بادشاہ مایوس نہ ہو تجھے فتح ہو گی۔ بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ شاید میاں میرؒ کا تو خالی نام ہے اصل بزرگ تو یہ ہے۔ جونہی بادشاہ کے دل میں یہ خطرہ آیا حضرت شیخ نے آدمی بھیج کر اُسے واپس بلایا اور فرمایا کہ ہم نے اپنے بلند مقام سے نیچے اُتر کر تمہاری جنگ کا نتیجہ دیکھنے کی تکلیف گوارا نہ کی اور فقط فتح کے لئے دعا کر دی تھی لیکن یہ کمبخت ہر وقت کشف و کرامات کے پیچھے پڑا ہے۔ ہم نے بہت کوشش کی ہے لیکن یہ چھچھورپن سے باز نہیں آتا۔ کبھی لوگوں کے دلوں میں جھانک رہا ہے کبھی قبروں کا حال معلوم کر رہا ہے جس سے اس کی ترقی رُکی ہوئی ہے۔ اس قسم کے واقعات اولیاء کرام کے حالات میں کثرت سے ملتے ہیں۔ ہمارے شیخ علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے کہ جو بہت بلند پایہ مشائخ ہوتے ہیں وہ اپنے مریدین کی آنکھیں بند کر کے اوپر لے جاتے ہیں اور کشف نہیں ہونے دیتے کیونکہ کشف سے اُلجھن پیدا ہو جاتی ہے اور ترقی رُک جاتی ہے۔ کشف عالم مثال

اور عالم ملکوت کی چیز ہے اور عالم مثال اور اس دنیا میں معمولی سا پردہ حائل ہے کوئی بلند چیز نہیں۔

حجاب کی قسمیں نیز فرمایا کہ حجاب تین قسم کے ہیں۔ پہلا حجاب ظلمانی جو گناہوں کی تاریکی سے بندہ اور خدا کے درمیان حائل ہوتا ہے دوسرا حجاب نورانی ہے یہ کشف وکرامات کا حجاب ہے جس سے ترقی بند ہوجاتی ہے تیسرا حجاب کیفی ہے جب سالک کے دل میں مقام قرب میں جاکر لذت محسوس ہوتی ہے تو بعض اوقات وہ لذت کی خاطر یہ کام کرتا ہے۔ بس نیت میں ذرا سا غبار پیدا ہوا اور اُدھر تیور بدل گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کشف ایک حجاب ہے جس کی ہمارے ہاں کوئی قدر ومنزلت نہیں۔ لیکن عیسائی۔ ہندو اور بدھ اس ذرا سی بات پر پھولے نہیں سماتے اور اسے منزلِ مقصود سمجھتے ہیں ع

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

کہاں یہ لوگ کہاں اولیاء اللہ۔ اس سے ظاہر ہے کہ عیسائی ہندو اور بدھ مت کے روحانی لوگوں کی فوقیت کے دعوے سب لاعلمی اور جہالت پر مبنی ہیں۔

بقا باللہ بجا طور پر تکمیلِ انسانیت ہے مقام بقا باللہ صرف اسلام کا خاصہ ہے اور اسے بجا طور پر انسانی عروج وکمال کی آخری منزل قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہی وہ مقام ہے کہ جہاں پہنچ کر انسانِ کامل کے سر پر خلافتِ الٰہیہ کا تاج رکھا جاتا ہے اور وہ اللہ کی طرف سے کائنات پر حکمرانی کرتا ہے۔ وہ غوث اور قطبِ مدار کے بلند ترین عہدوں پر فائز ہوتا ہے اور دنیا میں ہر کام اس کی وساطت سے ہوتا ہے اس باطنی حکومت کو نظامِ باطن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قیام کائنات کا دار ومدار اولیاء اللہ پر ہے۔ عبد اور رب کے درمیان یہ حضرات فیض رسانی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ امورِ تکوینی کے انصرام سے حق تعالیٰ ان کو مشرف فرماتا ہے۔ ان کی برکات سے نزولِ باراں سرسبزی نباتات اور بقائے انواعِ حیوانی اور آبادیٔ قصبات ہے۔ ان کی وساطت سے واقعاتِ دنیا رونما ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے بادشاہ بنتے اور تخت سے اُترتے رہتے ہیں لوگوں کی ترقی اور

تنزل ہوتا ہے۔ فوجیں لڑتی ہیں، رفع بلا اور دفع وبا ہوتا ہے۔ ان حضرات کے دو اقسام ہیں:

اولیاء ظاہرین اور اولیاء مستورین۔

اولیاء ظاہرین

اولیاء ظاہرین کے سپرد ہدایتِ خدمتِ خلق ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ ہدایتِ خلق کی خاطر یہ حضرات ظاہر ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اولیاء مستورین

ان حضرات کے سپرد انصرامِ تکوینی ہے یعنی دنیا کے کاموں کے انتظام کی خدمت سپرد ہوتی ہے۔ انھیں رجال الغیب کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ عام لوگوں کی طرح شہروں اور قصبوں میں رہتے ہیں۔ شادی بیاہ کرتے ہیں۔ بیمار پڑتے ہیں علاج کراتے ہیں مگر حق تعالیٰ ان کو لوگوں کی نگاہ سے مخفی اور پوشیدہ رکھتا ہے انہی کی شان میں فرمایا گیا ہے اَوْلِيَائِيْ تَحْتَ قَبَائِيْ لَا يَعْرِفُهُمْ غَيْرِيْ (میرے اولیاء میری قبا کے نیچے چھپے رہتے ہیں اور میرے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا) اولیاء اللہ ظاہرین ہوں یا مستورین ان کی بارہ اقسام ہیں:

اقطاب۔ غوث۔ امامان۔ اوتاد۔ ابدال۔ اخیار۔ ابرار۔ نقباء۔ نجباء۔ عمد۔ مکتوبان۔ مفردان۔ ہر زمانے میں تمام دنیا کے لئے بڑا قطب ایک ہوتا ہے جسے قطب عالم یا قطب ارشاد کہتے ہیں اور سارا عالم اسی کے فیض برکت سے قائم رہتا ہے۔ وہ اللہ سے براہِ راست فیض حاصل کرتا ہے۔ کسی بڑے شہر میں سکونت رکھتا ہے۔ بڑی عمر پاتا ہے۔ نورِ محمدی کی برکت سے ہر سمت میں دیکھتا ہے۔ ماتحت اقطاب کا تقرر یا تنزل کرتا ہے۔ ولی کو معزول یا مقرر کرنے کا مجاز ہے۔ اس کا باطنی نام عبداللہ ہوتا ہے۔

ماتحت اقطاب

قطب عالم کے ماتحت دوسرے اقطاب ہوتے ہیں مثلاً قطب ابدال قطب اقالیم۔ قطبِ ولایت وغیرہ۔ بعض کے نزدیک غوث اور قطب ایک ہی عہدہ کا نام ہے بعض کے نزدیک علیحدہ علیحدہ عہدے ہیں۔

امامان قطبِ عالم کے نیچے دو نائب ہوتے ہیں جن کو امامان کہا جاتا ہے۔ ایک اس کے دائیں ہاتھ پر ہوتا ہے دوسرا بائیں پر۔ بائیں ہاتھ والے کا مرتبہ دائیں ہاتھ والے سے بہتر ہوتا ہے اور قطبِ عالم کی جگہ خالی ہوتی ہے تو بائیں ہاتھ والا اس کی جگہ پر آجاتا ہے اور دائیں ہاتھ والا بائیں ہاتھ والے کی جگہ لیتا ہے۔

اوتاد ان کی تعداد چار ہے اور ہر ایک دُنیا کے چاروں کونوں پہ مامور ہوتا ہے ایک مغرب میں دوسرا مشرق میں تیسرا جنوب میں چوتھا شمال میں۔ قیامِ عالم میں ان سے میخوں کا کام لیا جاتا ہے اور یہ بمنزلہ پہاڑ ہوتے ہیں۔

ابدال یہ سات ہوتے ہیں اور سات اقلیم پر متعین ہوتے ہیں۔ ان کو قطبِ اقلیم بھی کہتے ہیں مکمل تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سترِ دلبراں" مصنفہ حضرت مولانا سید محمد ذوقی شاہ قدس سرہٗ۔ (ناشر محفلِ ذوقیہ۔ ڈون ہاؤس۔ للی روڈ کراچی۔ ۴)

یہ ہے نظامِ باطن جو اولیاء اللہ کے سپرد ہوتا ہے۔ اب آئیے ان حضرات کی زندگیوں کی نیرنگیاں ملاحظہ ہوں۔ بقا باللہ وہ مقام ہے کہ جہاں پہ اولیاء کرام کی محبت کی آزمائش ہوتی ہے۔ ان کا ایمان پرکھا جاتا ہے۔ ان پر کبھی نوازشات کی بارش ہوتی ہے کبھی ناز و انداز کی بجلیاں گرائی جاتی ہیں۔ کبھی عشوے غمزے دکھا کر انہیں نیم جان کیا جاتا ہے۔ کبھی تیرِ مژگاں اور تیغ ابرو سے ان کی تواضع کی جاتی ہے کبھی چشمِ نرگس۔ شیریں دہن اور شیریں لبوں کی حلاوت سے انھیں نوازا جاتا ہے کبھی جاہ و جلال کی بجلیاں گرائی جاتی ہیں۔ کبھی شربتِ وصل سے سیراب کیا جاتا ہے کبھی ہجر و فراق کے تیر برسائے جاتے ہیں کبھی زلف کے پھندوں میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ کبھی رُخِ انور کی ضیا باری سے منور کیا جاتا ہے۔ کبھی قرب سے پرورش ہوتی ہے کبھی بعد سے آزمایا جاتا ہے۔ کبھی بے خودی۔ محویت اور استغراق میں مست اور متوالا بنایا جاتا ہے۔ کبھی وحشت، خوف، ہیبت اور رعبِ جلال کی آگ میں جلایا جاتا ہے۔ کبھی بلبل کی طرح رونے گل پر نثار ہونے کی دعوت دی جاتی ہے تو کبھی شمعِ حسن پر پروانہ وار جلایا جاتا ہے۔ غرضیکہ محبوبِ حقیقی کے ناز و انداز، عشوے و غمزے بدلتے رہتے ہیں اور

یہ کھیل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور عاشق صادق ہر حال میں خوش و خرم رہتا ہے اور زبانِ حال سے کہتا رہتا ہے ؎

گر بکشی رضائے تو، ور نہ کشی عطائے تو
راحتِ من رضائے تو، راحتِ من رضائے تو

وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں اس لئے کہ دوست کا جلال اور جمال دونوں محمود ہیں۔ قرب میں وہ صفت جلال کا ملاحظہ کرتے ہیں اور بعد میں جمال کا۔ اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ان کی گریہ وزاری، ان کی آہ و بکا۔ اُن کے سوز و گداز، اُن کے درد و داغ، ان کے غم واندوہ، اُن کے ہجر و فراق، اُن کے وصل و انبساط ان کے ذوق و شوق، ان کے شعر و سخن، ان کے رقص و وجد، اُن کے علم و دانش، اُن کے فضل و کمال، اُن کی جد و جہد، ان کی کاوشوں، قربانیوں اور جاں نثاریوں کا مرجع، اُن کا ملجا، اُن کا منجا، ان کا ماویٰ، ان کی جان، ان کی عزت، اُن کی شان، اُن کی آن، ان کی بان، ان کے دین، اُن کے دھرم، اُن کے بھرم، ان کے زہد، ان کے تقویٰ، ان کے حج، اُن کے صوم، ان کی صلوٰۃ، ان کے جہاد، ان کی زندگی اور ان کی موت کا مقصد اور مدّعا، غرض و غایت محبوبِ حقیقی ہوتا ہے۔

جذبۂ فدایت | جذبۂ فدایت میں کوئی پکار اُٹھتا ہے ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آز مائی (عراقیؔ)

(خدا کرے کہ تیری تلوار کا وار دشمن کے نصیب میں نہ ہو اس نعمت کے لئے تو تیرے دوست ترس رہے ہیں)

قلندری کی خواہش | عبادات و مجاہدات سے جب عقدہ کشائی نہیں ہوتی تو بے صبری کے عالم میں چلّا کر کہتے ہیں ؎

صنما رہِ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی (عراقیؔ)

(اے دوست مجھے تو قلندر بنا کر مست کر دے عبادت و پارسائی کا راستہ بہت دراز ہے)

اپنے آپ کو ملامت جب دوست کی شان کے مطابق اپنے اندر جذباتِ وفا نہیں پاتے تو پکار اُٹھتے ہیں ؎

چو بزمین سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد
تو مرا خراب کردی بہ ایں سجدۂ ریائی (عراقیؒ)

(جب میں نے زمین پر سجدہ کیا تو زمین سے آواز آئی کہ مجھے ریاکاری کے سجدوں سے کیوں ناپاک کر رہا ہے)

کمالِ خلوص مصر کے صوفی شاعر ابنِ فارضؒ کا جب آخری وقت قریب آیا تو آپ کو سات بہشت دکھائے گئے کہ یہ تیرا مقام ہے۔ آپ نے منہ پھیر لیا اور یہ شعر کہا ؎

اِنْ كَانَ مَنْزِلَتِيْ عِنْدَ كُمُوْ
مَا رَاَيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ اَيَّامِيْ

(اگر میرے عشق کی یہی قدر و منزلت ہے جو میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے عمر برباد کی)
اس کے بعد آپ پر تجلّیٔ خاص ہوئی اور اسی میں جاں بحق ہوئے۔
اس کیفیت کو مرزا غالب نے خوب ادا کیا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

عاشق نہ جنت چاہتا ہے نہ دوزخ کی طرف دوڑتا ہے عاشق وہاں رہنا چاہتا ہے جہاں اس کا دوست ہے خواہ وہ دوزخ ہے یا بہشت۔ اس حقیقت کو کسی نے خوب ادا کیا ہے ؎

ہر کجا یوسف رُخے باشد چو ماہ — جنت است آں گرچہ باشد قعرِ چاہ
با تو جنت دوزخ است اے جانفزا — بے تو جنت، دوزخ است اے دلربا

خلوص

حضرت کلاآبادی اپنی کتاب تصوف میں لکھتے ہیں کہ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ مجھے ایک ایسی حسین وجمیل خاتون سے ملنے کا اتفاق ہوا کہ جس نے میرے دل ودماغ پر قبضہ کر لیا۔ میں نے کہا تو نے مجھے خرید لیا ہے۔ اس نے کہا میری بھی یہی حالت ہے لیکن میری ایک بہن ہے اگر تو اُس کو دیکھ لے تو میں بھول جاؤں گی۔ میں نے کہا وہ کہاں ہے اس نے کہا تیرے پیچھے کھڑی ہے۔ جب میں نے پیچھے مڑکر دیکھا تو اس نے میرے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ گردن مُڑ گئی اور چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اس نے کہا کذّاب، بطّال (جھوٹا) دعویٰ میرے عشق کا کرتا ہے اور دیکھتا ہے غیر کو۔ یہ ہے غیرتِ حسن۔ جس سے واصلینِ بارگاہِ قدس کو ہمیشہ واسطہ رہتا ہے اور جو حضرات ثابت قدم رہتے ہیں اُن پر الطاف وعنایات کی اس قدر بارش ہوتی ہے کہ تحریر سے باہر ہے۔

جذبۂ تسلیم و رضا

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکی قدس سرہٗ ایک محفلِ سماع میں شامل ہوئے۔ قوالوں نے حضرت احمد جامؒ کی یہ غزل شروع کی ؎

منزلِ عشق از مکانِ دیگر است
مردِ ایں راہ رانشانِ دیگر است

جب اس مقطع پر پہنچے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

تو آپ پر وجد طاری ہوگیا۔ سات دن رات آپ حالتِ وجد میں رہے۔ جب نماز کا وقت آتا تھا آپ باہر ہو کر نماز پڑھ لیتے تھے اور پھر وجد کرنے لگتے تھے۔ آپ کی حالت یہ تھی کہ جب قوال پہلا مصرع پڑھتے تھے یعنی "کشتگانِ خنجرِ تسلیم را" تو آپ جاں بحق ہو جاتے تھے۔ جب دوسرا مصرع پڑھا جاتا تو آپ رقص کرنے لگ جاتے تھے۔ آخر آپ نے قوالوں کو اشارہ فرمایا کہ دوسرا مصرع نہ پڑھنا۔ چنانچہ پہلے مصرع پر جب آپ جاں بحق تو قوال خاموش ہوگئے اور آپ ہمیشہ کے لئے واصل باللہ ہوگئے۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کا جذبۂ تسلیم و رضا

جب دہلی کے بادشاہ کے ایک شیعہ وزیر نے سنی بزرگ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کو شہید کرادیا تو آپ خاک و خون میں غلطاں اس شعر کا ورد و زبان رہے یعنی ؎

زخمِ دل مظہرؔ مبادا بہ شود ہشیار باش
کیں جراحت یادگارِ ناوکِ مژگانِ اوست

(اے مظہرؔ دعا کرو کہ زخمِ دل اچھا نہ ہو کیونکہ یہ کسی کے تیرِ مژگاں کی یادگار ہے)

مولانائے رومؒ کا جذبہ

اسی مضمون پر مولانائے رومؒ فرماتے ہیں ؎

نیم جاں بستانند و صد جاں دہند
آنچہ در وہمت نیاید آں دہند

(آدھی جان لیتے ہیں اور اس کے عوض سو جان عطا کرتے ہیں اور اس قدر انعام عطا کرتے ہیں کہ وہم و گمان میں بھی نہیں آتا)

لطفِ مخفی درمیانِ قہرہا
در حذف مخفی عقیقِ بے بہا

(دوست کے قہر میں لطف مخفی ہے جیسے سیپ کے اندر بے بہا ہیرہ مخفی ہوتا ہے)

نیز فرمایا ؎

لطفہا مضمر اندر قہرِ او
جاں سپردن جاں فزاید بہرِ او

(اس کے قہر میں لطف پوشیدہ ہیں۔ اس کی خاطر جان دینا سو جان لینا ہے)

طفل مے لرزد زنیشِ احتجام
مادرِ مشفق دراں غم شاد کام

(ماں بچے کو رگ زن کے پاس لے جاتی ہے بچہ درد کے مارے کانپ رہا ہے ماں اس کے درد میں خوش ہے)

سعدیؒ کا جذبۂ فدائیت | سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

من چہ درپائے تو ریزم کہ سزائے تو بود
سر نہ چیز لیست کہ شائستۂ پائے تو بود

(اے دوست میں تیرے قدموں میں کیا نثار کروں جو تیرے قابل ہو میرا سر تو اس قابل نہیں کہ تیرے قدموں کا شرف حاصل کر سکے۔)

بوعلیؒ قلندر کا جذبہ | آپ فرماتے ہیں ؎

ہم چوں پروانہ بسوزیم و بسازیم بعشق   اگر آں شمع کند جلوہ بہ کاشانۂ ما
گفت او خندہ زناں گریہ چوں کردم بہ برش   بوعلی ہست مگر عاشق دیوانۂ ما

(پروانہ کی طرح ہم عشق یار میں جل رہے ہیں اور خوش ہیں اگر وہ شمع ایک دن میری کٹیا میں جل جائے)

ایک اور صاحب فرماتے ہیں ؎

توحید متاعیست کہ بر دار فروشند
گل نیست کہ در کوچہ و بازار فروشند

(توحید وہ مال ہے جو دار پر بکتا ہے۔ پھول نہیں کہ کوچہ و بازار میں بکتا ہو)

ایک صاحب فرماتے ہیں ؎

پاس ادب بہ بیں کہ بکوئیت شہید عشق
با ہیئتے تپید کہ خاک از زمیں نہ خاست

(پاس ادب دیکھو کہ تیرا شہیدِ عشق تیرے کوچے میں اس طرح تڑپا کہ خاک بھی نہ اُڑی)

ایک صاحب فرماتے ہیں ؎

من لذّتِ دردِ تو بہ درماں نفروشم
کفرت سرِ زلفِ تو بہ ایماں نفروشم

(تیرے درد کی لذت کو میں دوا کے بدلے نہ بیچوں گا۔ تیری زلف کے کفر کو ایمان کے بدلے نہ دوں گا)

یہاں مقام دوئی اور ہجر و فراق کو فنا اور وصلِ یار پر ترجیح دی جا رہی ہے کیونکہ دوئی کی لذتِ درد ان کو زیادہ پسند ہے۔

کوئے دوست | خواجہ حافظ شیرازیؒ کوئے دوست کی یوں تعریف کرتے ہیں ؎

باغِ بہشت و سایۂ طوبیٰ و قصر و حور
با خاکِ کوئے دوست برابر نمی کنم

(باغِ بہشت حور و قصور اور اس کے مزے دوست کے کوچہ کی خاک کی برابری کب کر سکتے ہیں)

زخمِ دل سے محبت | ایک صاحب زخمِ دل سے اس طرح خوش ہوتے ہیں ؎

تازہ شد زخمِ دلم از فیضِ نمکدانِ کسے
زندہ شد نخلِ دلم از آبِ پیکانِ کسے

(کسی کے نمکدان کے فیض سے یعنی نمک پاشی سے زخمِ دل تازہ ہوا اور کسی کی تلوار سے نخلِ دل پھر زندہ ہوا)

قدِ دوست | دوست کی قامتِ راست کو کسی نے کس حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے ؎

راستیٔ فتنہ انگیز است سروِ قامتش
ہستیٔ ما جز دروغِ مصلحت آمیز نیست

(اس شعر میں سعدیؒ کے اس مقولہ پر بحث کی گئی ہے "دروغِ مصلحت آمیز بہ ز راستیٔ فتنہ خیز یعنی جس سچ سے فساد پیدا ہو اس سے وہ جھوٹ اچھا ہے جس سے صلح ہو۔ اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ دوست کا قدِ بلند راستیٔ فتنہ انگیز ہے یعنی دوست کا وجود برحق محبوبوں کی طرح فتنہ برپا کرنے والا ہے اور ہماری ہستی کیا ہے دروغِ مصلحت آمیز ہے یعنی انسان کی ہستی حقیقی نہیں وہمی اور جھوٹی ہے لیکن مصلحت آمیز اس لئے ہے کہ اس اللہ تعالیٰ کا یہ کھیل چل رہا ہے۔)

غالب اور قدِ یار | غالب نے دوست کے قد کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے عشاق اس پر رشک کرتے رہیں گے۔ فرماتے ہیں ؎

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

قدِ یار اور خواجہ حافظ خواجہ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

(اے زاہد طوبیٰ سے تیری مراد بہشت کا درخت ہے اور میری مراد قامتِ یار ہے پس ہر شخص اپنی ہمت کے مطابق سوچتا ہے)

اس غزل کا مقطع یہ ہے ؎

فقرِ ظاہر مبیں کہ حافظ را
سینہ گنجینۂ محبتِ اوست

(حافظ کی ظاہری درویشی اور غربت کو نہ دیکھو اس کا سینہ دوست کی محبت سے لبریز ہے)

قدِ یار اور مستان شاہ کابلی قدِ یار کی تعریف میں آپ فرماتے ہیں ؎

قامتِ تو قیامت است ہر نگہ تو محشرے
محشرِ تازہ کن بیا چشم سیاہ مست را

(تیرا قد قیامت ہے۔ قیامت کے معنی کھڑا ہونے کے ہیں۔ تیری ہر نگاہ محشر (قیامت) ہے اب دلِ عشاق کو جلانے کے لئے اپنی چشم سیاہ سے ایک اور قیامت برپا کر دو)

اس شاندار غزل کے چند مزید اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نیم کرشمہ ناز دہ نرگسِ نیم مست را
مستِ شرابِ غمزہ کن بادہ کشِ الست را

(اے دوست اپنی چشم نرگس سے جو مخمور اور نیم مست ہے کرشمہ پیدا کر اور الست بربکم قالوا بلیٰ کے شرابی کو شرابِ غمزہ سے مست کر)

برقعہ ز روئے برکشا پردۂ انفِ باز گیر عارضِ حق نما نما عاشقِ حق پرست را

ا۵ اس شعر پر حضرت مولانا وارث شاہ حسن کو پانچ دن وجد رہا۔

(رُخِ انور سے برقعہ اُٹھا اور زلف کو بھی منہ سے ہٹا کر عاشقِ حق پرست کو اپنا عارض (چہرہ) حق نما دکھا)

حضرت شہید اور قامتِ یار | شہید فرماتے ہیں ؎

بہ قامت خون عالم ریختی پوشیدہ پوشیدہ
قیامت قامتت را بوسہ زد ترسیدہ ترسیدہ

(اے دوست تو نے اپنے قدِ قیامت خیز کی بدولت ساری دنیا کا چھپ چھپ کر خون بہایا اور قیامت نے ڈر ڈر کر تیرے قد کو بوسہ دیا۔)

شریعت اور طریقت دونوں میں کمال | اولیاء اللہ کی یہی کوشش رہی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ محویت و استغراق میں کہیں شریعت کا دامن ہاتھ سے جاتا رہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل شعر اولیاء اللہ کے ارادہ اور نیت کی ترجمانی کرتا ہے ؎

بر کفِ جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

(ایک ہاتھ میں جامِ شریعت ہے ایک ہاتھ میں عشق کی تلوار (یہاں تلوار مرادی معنی ہیں اصل معنی آئرن IRON ہیں، ہر ہوسناک یعنی ہر شریعت اور طریقت کا دعوے دار جامِ شریعت اور تلوارِ عشق یکجا نہیں کر سکتا۔ صرف مردانِ خدا کر سکتے ہیں)

میدانِ قیامت میں عشق و مستی کے واردات | جہاں عوام الناس اور صالحین کا قیامت کے خوف سے دم خشک ہو گا اور عاشقانِ الٰہی کی حالت یہ ہو گی ؎

روزیکہ مقدسانِ خاکی مدفن — گردند باز سوار بر مرکبِ تن
آغشتہ بخونِ خویش آلودہ کفن — از خاکِ سرکوئے تو خیزم

(جس روز نیک لوگ اپنے خاکی مسکن یعنی قبر سے نکل کر دوبارہ جسم کے گھوڑے پر سوار ہو رہے

ہوں گے تیرا عاشق اپنے خون میں لتھڑا ہوا اور کفن آلودہ کئے ہوئے تیرے کوچہ کی خاک سے اُٹھے گا)

اسی حالت کو ایک اور صاحب نے یوں بیان کیا ہے ؎

پینداری کہ عشق تو رَوَد از دلِ عاشق
چوں میرد مبتلا میرد چوں خیزد مبتلا خیزد

(اے دوست یہ نہ سمجھ کہ تیرا عشق کسی وقت عاشق کے دل سے دور ہو سکتا ہے۔ جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے۔ جب اُٹھتا ہے مبتلا اُٹھتا ہے)

حضرت امیر خسروؒ فرماتے ہیں ؎

روزیکہ ذرّہ ذرّہ شود استخوانِ من
باشد ہنوز در دلِ ریشم ہوائے تو

(جس روز میری ہڈیاں خاک میں مل کر ذرّہ ذرّہ ہو جائیں گی اُس وقت بھی میرے زخمی دل میں تیرا عشق موجزن ہو گا)

عجز و نیاز اولیاء اسلام کی خصوصی شان یہ ہے کہ "فنا فی اللہ" اور "انا الحق" کے نعروں کے باوجود وہ شریعت کی اس قدر پابندی کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو بارگاہِ حق تعالےٰ کا ادنیٰ ترین کتا اور غلام سمجھتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ مے بندی
چرا بہ گردنِ حافظ نمی نہی رَسنے

(سُنا ہے کہ تو اپنے کتے کی گردن پٹہ ڈال رہا ہے حافظ کی گردن میں رسّی کیوں نہیں ڈالتا)

حضرت جامی فرماتے ہیں ؎

ز طوقِ سگاں مدار محروم
گر خلعتِ خاص را نشائیم

(اے دوست اگر خلعتِ خاص کے ہم لائق نہ ہوں تو کتّوں کے طوق (پٹہ) سے تو محروم

نہ رکھ)

ایک اور صاحب فرماتے ہیں ؎

حلقۂ درگردنم افگندہ دوست
مے بَرَد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(دوست نے میری گردن میں حلقہ ڈال رکھا ہے اور جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے)

نیز جامیؒ فرماتے ہیں ع

سگت را کاش جامی نام بودے

(کاش کہ یارسولؐ اللہ تیرے کتے کا نام جامی ہوتا)

امیر خسروؒ فرماتے ہیں ؎

خسرو تو بس بلند شدی در مقام عشق
گویا بپاء بوس سگانش رسیدۂ

(اے خسرو اب تیرا مرتبہ عشق میں بہت بلند ہو گیا کیونکہ تو دوست کے کتوں کے پاؤں تک پہنچ گیا ہے)

ایک اور صاحب فرماتے ہیں ؎

کمتریں صید توام پیش سگانِ خود فگن
من نیم لائق آلائشِ فتراکِ تو

(اے دوست میں تیرا کمترین شکار ہوں مجھے اپنے کتوں کے سامنے پھینک دے۔ میں تیرے شکار کے تھیلے کے قابل نہیں ہوں)

ہجر و فراق جب عاشقانِ الٰہی پر وصل کا دروازہ بند ہوتا ہے تو رو رو کر نیم جان ہوتے ہیں اور اس طرح نوحہ جات کرتے ہیں ؎

امروز دیگرم در انتظار تو شام شد ۔ در انتظارِ وصل تو عمرم تمام شد
آمد نماز شام و نہ آمد نگارِ من ۔ اے دیدہ پاسدار کہ خوابم حرام شد (سعدیؒ)

(آج ایک اور دن تمہارے انتظار میں شام ہوگیا اسی طرح عمر تیرے وصل کے انتظار میں تمام ہوگئی۔ نمازِ شام کا وقت آیا دوست نہ آیا اے آنکھ گنتی جا کہ کس طرح میری نیند حرام ہو رہی ہے)

امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

خبرم رسید امشب کہ نگار خواہی آمد — سرِ من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد
ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف — بہ امیدِ آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد
بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم — پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد
کششے کہ عشق دارد نگذاردت بدینساں — بہ جنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی آمد

(۱۔ آج خبر ملی ہے کہ دوست آرہا ہے میرا سر اس راہ پر بچھ جائے گا کہ جہاں دوست کی سواری آرہی ہے)
(۲۔ جنگل کے تمام ہرن اپنے سر ہاتھ پر رکھے اس امید میں کھڑے ہیں کہ شاید ایک دن دوست شکار کو آجائے۔ ہرن سے یہاں مراد محبوبانِ مجازی ہیں یعنی تمام محبوب مجازی اس محبوبِ حقیقی کے انتظار میں جان بکف ہیں)
(۳۔ اے دوست میری جان لبوں پر آگئی ہے تو آ تاکہ میں زندہ رہ سکوں میرے مرنے کے بعد آیا تو کیا فائدہ)
(۴۔ عشق وہ کشش رکھتا ہے کہ تجھے ہرگز نہیں چھوڑے گا اگر میرے جنازہ پر نہ آیا تو قبر پر ضرور آئے گا)

احمد شاہ جہانپوری فرماتے ہیں ؎

دل را بہ آتشِ غمِ جاناں سوختیم — قندیلِ کعبہ را بہ صنم خانہ سوختیم
زاں آرزو کہ جلوہ کند شعلہ پیکرے — شبہا چراغِ کعبہ و بتخانہ سوختیم

(ہم نے دل کو آتشِ عشق میں جلا کر راکھ کر دیا اور کعبہ کی قندیل (دل) کو بتخانہ میں جلا دیا۔ اس آرزو میں کہ کسی روز وہ شعلہ پیکر دوست جلوہ دکھائے۔ ہم نے برسوں کعبہ اور بتخانہ کے چراغ جلائے)

ایک صاحب فرماتے ہیں ؎

سرو سیمنا بصحرا مے روی　　سخت بے مہری کہ بے ما مے روی
اے تماشا گاہِ عالم روئے تو　　تو کجا بہر تماشا مے روی

ایک اور صاحب یوں فرماتے ہیں ؎

مستان کہ شراب ناب خورند
از پہلوئے خود کباب خورند

اس غزل پر حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ کو وجد آگیا اور چراغ گل کر کے رقص کیا۔ صبح عبداللہ نامی رومی قوال کو بیس روپے اور خلعت بھیج دی۔ اس وقت کے بیس روپے آج کل کے بیس ہزار کے برابر ہوں گے۔

ایک دفعہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے بھانجے اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے داماد حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ ہمدان کے مدرسہ میں درس دے رہے تھے کہ قلندروں کی ایک جماعت پہنچی اور مندرجہ ذیل غزل پڑھی ؎

ما رخت زمسجد بخرابات کشیدیم　　خط بر ورق زُہد و کرامات کشیدیم
در کوئے مغاں در صفِ عشاق نشستیم　　جام از کفِ رندانِ خرابات کشیدیم
از زہد و مقامات گذشتیم کہ بسیار　　کاس و تعب از زہد و مقامات کشیدیم

ان اشعار کو سن کر عراقی بے تاب ہو گئے۔ وجد طاری ہو گیا۔ اس جماعت میں ایک نوجوان قلندر تھا جس کا حسن و جمال بے نظیر تھا۔ اس کو دیکھ کر عراقی کے دل میں آتشِ عشق بھڑک اٹھی۔ کپڑے پھاڑ ڈالے، عمامہ پھینک دیا اور یہ شعر پڑھنے لگے ؎

کہ خوش باشد دل آرامم تو باشی
ندیم و مونس و یارم تو باشی

اس کے بعد آپ تمام مشاغلِ درس و تدریس چھوڑ کر قلندروں کے ہمراہ چل پڑے اور ملتان پہنچ گئے۔ یہاں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے بھانپ لیا کہ عراقی مردِ خدا ہے، اپنے پاس رہنے کو کہا۔ لیکن آتشِ عشق میں ان کا جگر کباب

ہو رہا تھا قلندروں کو ترک نہ کر سکے اور دہلی روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایسا طوفان آیا کہ قلندر منتشر ہو گئے اور عراقی راستہ بھول کر پھرتے پھراتے پھر ملتان جا پہنچے اور بیعتِ شیخ سے مشرف ہوئے۔ شیخ نے ان کو ایک ہفتہ خلوت میں رکھا۔ خلوت میں بیٹھے بیٹھے انھوں نے یہ غزل کہہ ڈالی ؎

نخستیں بادہ کاندر جام کردند ۔۔۔ زچشمِ مستِ ساقی وام کردند

چوں بے خود ساختند اہلِ طرب را ۔۔۔ شراب بے خود در کام کردند

برائے صیدِ مرغِ جانِ عاشق ۔۔۔ زلفِ فتنہ جویاں دام کردند

بہ عالم ہر کجا رنج و بلا بود ۔۔۔ بہم کردند و عشقش نام کردند

چو خود کردند رازِ خویشتن فاش

عراقیؒ را چرا بدنام کردند

خلوت میں بیٹھے بیٹھے آپ نے اس غزل کو گانا شروع کر دیا اور لوگوں نے باہر سے سُن کر نقل کر لیا۔ اور شہر کے کوچہ و بازار میں قوالوں نے اُسے گانا شروع کر دیا۔ شیخ کے مریدین نے شکایت کی کہ یہ عراقی کا حال ہے (یاد رہے اس وقت شریعت کا احترام تھا اور گانا ممنوع تھا) لیکن حضرت شیخ نے عراقی کی بے خودی کو دیکھ کر درگزر فرمایا۔

عراقی کی ایک اور غزل بھی بہت مشہور ہے ؎

در کوئے خرابات کسے را کہ نیاز است ۔۔۔ ہشیاری و مستی اش ہمہ عین نماز است

از میکدہ آواز بر آمد بہ عراقیؔ ۔۔۔ در باز تو خود را کہ درِ میکدہ باز است

صابر پاکؒ کا عشق

آتشِ عشق میں جل کر حضرت خواجہ علاء الدین علی احمد صابرؒ یوں فرماتے ہیں ؎

من ز سودائے محبت والہ و دیوانہ ام ۔۔۔ عاشقِ شوریدہ سر محوِ رُخِ جانانہ ام

قبلہ گویم یا پیغمبر یا مصطفٰے ۔۔۔ اسلائے شوق بسیار است و من دیوانہ ام

من بہ قربانت شوم اے ساقیٔ بادہ فروش ۔۔۔ از شرابِ بے خودی لبریز کن پیمانہ ام

عشق آں شوخ پری رو جانِ صابر سوختہ ۔۔۔ من نہ دانم شمع ام یا شمع را پروانہ ام

ایک دفعہ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے سامنے دو غزلیں پڑھی گئیں جن پر آپ کو وجد آگیا ؎

جفا بر عاشقاں گفتی نخواہم کرد ہم کردی ‏ ‏ ‏ قلم بر بے دلاں گفتی نخواہم راند ہم راندی

دوسری غزل یہ تھی ؎

ما طبل مخانہ دوش بے باک زدیم ‏ ‏ ‏ عالی عَلَمش بر سرِ افلاک زدیم

از بہرِ یکے مغبچہ مے خوارہ ‏ ‏ ‏ صد بار کلاہِ توبہ بر خاک زدیم

دولتِ فقر

اولیاء اللہ فقر و فاقہ پر حدیث الفقرُ فخری (فقر میرا فخر ہے) کی اتباع میں اس قدر ناز کرتے ہیں کہ دنیا و مافیہا ان کی نظروں میں ہیچ ہوتا ہے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

صحتِ نفس و قوتِ یک روزہ

بہتر از تاج و تختِ فیروزہ

ایک دفعہ غوث الاعظم حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ کی خدمت میں بادشاہ وقت سلطان سنجر نے اپنی ایک بیش قیمت جاگیر جس کا نام "نیم روز" تھا پیش کی تو آپ نے قبول کرنے سے انکار فرمایا اور یہ رباعی شاہی پروانہ کی پشت پر لکھ کر بھیج دی ؎

چوں چترِ سنجری رُخِ بختم سیاہ باد ‏ ‏ ‏ در دل اگر بُوَد ہوسِ ملکِ سنجرم

زانگہ کہ یافتم خبر از ملکِ "نیم شب" ‏ ‏ ‏ ملکِ "نیم روز" بیک جَو نمے خرم

(سلطان سنجر کے سیاہ جھنڈے کی طرح میرا بخت سیاہ ہو اگر میرے دل میں سلطان سنجر کے ملک کی خواہش ہو۔ جب سے مجھے ملکِ نیم شب (شب بیداری) کا علم ہوا ہے بادشاہ کے پیش کردہ "ملک نیم روز" کی قدر میرے دل میں ایک جَو کے برابر بھی نہیں رہی)

اس مضمون کو عراقی یوں بیان کرتے ہیں ؎

بہ سکندر و سلیماں بہ بُرائے صبا پیامے

بہ شما است ملک و دولت من و ملک بے نوائی

دولتِ فقر کو ایک صاحب یوں ادا کرتے ہیں ؎

من تاجدارِ فقرم ذوقِ فنا چشیدہ
آہوئے دشتِ ہُویم از ماسویٰ رمیدہ

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ جو حضراتِ دیوبند کے پیر و مرشد ہیں فرماتے ہیں ؎

اگرچہ بے خود و مستم ولے ہشیار مے گردم
بباطن شاہِ کونینم بظاہر خوارے گردم

مولانا محمد یار صاحب گڑھی بختیار خاں (رحیم یار خاں) فرماتے ہیں ؎

ما سلطنت بکوچۂ جاناں فروختیم
مورِ حقیر را بہ سلیماں فروختیم

ہلالیؔ فقر کے متعلق یہ فرماتے ہیں ؎

از پادشاہی ہمہ آفاق خوشتر است
ایں سلطنت کہ گشت ہلالیؔ گدائے تو

اس مضمون پر سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

ملک دنیا در چشمِ سعدی ہیچ است
بادشاہی اش بس است کہ گدائے تو بود

خاقانیؒ فرماتے ہیں ؎

پس از سی سال ایں نکتہ محقق شد بہ خاقانی
کہ سلطانی است درویشی و درویشی است سلطانی

خواجہ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

چوں بے خود گشت حافظؒ کے شمارد
بیک جَو دولتِ کاؤس و کَے را

عشقِ حقیقی | عارفین جب عشقِ مجازی سے گزر کر عشقِ حقیقی کے میدان میں پہنچ جاتے

ہیں تو ان کے شعر و سخن کا رنگ بدل جاتا ہے اور محبوب حقیقی کے ساتھ لَو لگا کر شب و روز مست و بے خود رہتے ہیں۔ بہلولِ دانا جن کا مزار غزنی (افغانستان) میں ہے فرماتے ہیں۔

روشن از عکسِ جمالش عالمِ امکانِ ما
یک نگاہِ نازِ جاناں قیمتِ ایمانِ ما

ایک اور صاحب فرماتے ہیں ؎

اے خاک در گہہ تو جبینِ نیازِ ما — قربانِ یک نگاہِ تو عمرِ درازِ ما
در کنجِ ظلمتم گذرے کن گہے — اے آفتابِ عالم و ذرہ نوازِ ما

مولانا روم فرماتے ہیں ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

مقامِ فنا کا کلام آتشِ عشق میں جل کر راکھ ہونے کے بعد جب مقامِ توحید یا مقامِ وصل میں پہنچ جاتے ہیں تو اسرار و رموز کے بیش قیمت موتی ان کی زبانِ درفشاں سے نکلتے ہیں۔

مولانا روم کا نالہ اِس سلسلے میں حضرت مولانا روم علیہ رحمہ کی مشہور غزل جسے صنعت کے لحاظ سے مستزاد کہا جاتا ہے پیشِ خدمت ہے۔ پوری غزل اس لئے لکھی جاتی ہے کہ اب یہ گم ہوتی جا رہی ہے۔ توحید میں گم ہو کر جب ہر جگہ محبوب نظر آیا تو چلا اُٹھے ؎

ہر لحظہ بشکل آں بتِ عیار برآمد، دل برد و نہاں شُد
ہر دم بہ لباسِ دگر آں یار برآمد، گہہ پیر و جواں شد
گاہ نوحؑ شدہ کرد جہانے بہ دعا غرق، خود رفت بکشتی
گہہ گشت خلیل از درِ نار برآمد، آتش بہ گلستاں شد
یوسف شدہ از مصر فرستاد قمیصے، آں جلوہ گرِ عالم

در دیدۂ یعقوب چو انوار بر آمد۔ تا دیدہ عیاں شد
یونس شدہ در بطن سمک رفتہ بدریا۔ از بہر طہارت
موسیٰ شدہ جو یندۂ دیدار بر آمد۔ بر طور رواں شد
خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ، خود رند سبو کش
خود بر سر آں کوزہ خریدار بر آمد۔ بشکست و رواں شد
خود گشتہ صراحی، سلکیں، صہبا، ساقی۔ خود بزم نشیں شد
خود خورد آں مُل و مست بہ بازار بر آمد۔ شور دل و جاں شد
ایں جملہ ہمیں بود کہ مے آمد و مے رفت۔ ہر قرن کہ دیدی
تا عاقبت الشکل عرب دار بر آمد۔ دارائے جہاں شد
نے نے کہ ہمیں بود کہ مے گفت انا الحق۔ در صورت منصور
منصور نہ آں بود کہ بردار بر آمد۔ ناداں بگماں شد
رومی سخن کفر نگفتہ است نگوید منکر مشو یدش
منکر شدہ آنکس کہ بہ انکار بر آمد۔ مردود جہاں شد

مغربیؒ کا نالہ | ہر ہر شے میں جلوۂ یار دیکھ کر مغربی نے یہ آہ و نالہ کیا ؎

ہر سو کہ دویدیم ہمہ روئے تو دیدیم
ہر جا کہ رسیدیم سر کوئے تو دیدیم
ہر قبلہ کہ بگزیدہ دل از بہر عبادت
آں قبلۂ دل را خم ابروئے تو دیدیم
ہر سرو رواں را کہ دریں گلشن دہر است
بر رُستہ ز بستان لب جوئے تو دیدیم
روئے ہمہ خوبان جہاں را بہ تماشا
دیدیم و لے آئینہ روئے تو دیدیم
در دیدۂ شہلائے بتان ہمہ عالم
کردیم نظر نرگس جادوئے تو دیدیم
تا مہر رخت بر ہمہ ذرات بتابد
ذرات جہاں را بہ تکاپوئے تو دیدیم
در ظاہر و در باطن بہ مجاز و بحقیقت
خلقے دو جہاں را ہمہ در روئے تو دیدیم
ہر عاشق دیوانہ کہ در جملہ کتاب است
در پائے دلش سلسلۂ موئے تو دیدیم

سرِ حلقۂ رندانِ خراباتِ مغاں را ۔۔۔ دل در شکنِ حلقۂ گیسوئے تو دیدیم
از مغربیؔ احوال میرسید کہ او را
سودا زدۂ طرۂ ہندوئے تو دیدیم

حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

من نہ ام واللہ یاراں من نہ ام ۔۔۔ جانِ جانم سرِ سترم من نہ ام
نورِ پاکم آمدہ در مشتِ خاک ۔۔۔ کور چشماں را ولے روشن نہ ام
اوست اندر سترِ من ظاہر شدہ ۔۔۔ من نہ ام مسعود واللہ من نہ ام

شاہ نیاز احمد بریلویؒ نے اسی مضمون میں یہ غزل کہی ہے ؎

رفتم اندر تہِ خاک عشقِ تنانم باقیست ۔۔۔ عشقِ جانم بربود آفتِ جانم باقیست
کاروانم ہمہ بگذشت زمیدانِ شہود ۔۔۔ ہمچوں نقشِ کفِ پا نام و نشانم باقیست
خس و خاشاکِ وجودم شررِ عشق بسوخت ۔۔۔ زیرِ خاکسترِ دل سوزِ نہانم باقیست
طمع فاتحہ از خلق نہ داریم نیازؔ ۔۔۔ عشقِ من در پسِ من فاتحہ خوانم باقیست

ذات و صفات میں فنائے تامہ کے بعد مغربیؔ فرماتے ہیں ؎

ما جامِ جہاں نمائے ذاتیم ۔۔۔ ما مظہرِ جملۂ صفاتیم
ما نسخۂ نامۂ الٰہیم ۔۔۔ ما گنجِ طلسمِ کائناتیم
ہم صورتِ واجب الوجودیم ۔۔۔ ہم معنیٔ جانِ ممکناتیم
ہر چند کہ مجملِ دو کونیم ۔۔۔ تفصیلِ جمیعِ مجملاتیم
برتر ز مکان و در مکانیم ۔۔۔ بیروں زجہات و در جہاتیم
ہم مغربیؔ ہم مشرقی و ہم شمس
ہم ظلمتِ چشمۂ و ہم حیاتیم

اسی مضمونِ توحید پر حضرت شاہ شرف الدین احمد منیری قدس سرہٗ کے سامنے جب یہ اشعار پڑھے گئے، تو آپ کو وجد آگیا اور سرِ مبارک ستون سے ٹکرا کر زخمی ہوگیا ؎

اے قوم بہ حج رفتہ کجائید کجائید ۔۔۔ معشوق ہمیں جاست بیائید بیائید
آنانکہ طلبگارِ خدائید خدائید ۔۔۔ حاجت بہ طلب نیست شمائید شمائید
چیزیکہ نکردید گم از بہرِ چہ جوئید ۔۔۔ کس غیر شما نیست کجائید کجائید

اس مضمون پر حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی یہ رباعی بہت مقبول ہوئی ہے ؎

لَا اٰدَمَ فِی الْکَوْنِ وَلَا اِبْلِیْسُ ۔۔۔ لَا مُلْکُ سُلَیْمَانِ وَلَا بِلْقِیْسُ
فَالْکُلُّ عِبَارَۃٌ وَّاَنْتَ الْمَعْنٰی ۔۔۔ یَا مَنْ هُوَ لِلْقُلُوْبِ مَقْنَاطِیْسُ

(کائنات میں نہ آدم ہے نہ ابلیس نہ ملک سلیمان ہے نہ بلقیس یہ سب عبارات ہیں اور اے محبوبِ حقیقی تو معنی ہے اور تمام قلوب کے لئے تو مقناطیس ہے)

مقامِ عبدیت مقام توحید، عروج، وصل و فنا سے نکل کر جب دوئی میں آتے ہیں تو قفسِ ہجر و فراق میں گرفتار ہو کر آہ و نالہ کرتے ہیں اور سوز و گداز کے عالم میں خود بھی جلتے ہیں اور دوسروں کو بھی جلاتے ہیں۔

مولانا جامیؒ فرماتے ہیں ؎

از حسنِ ملیح خود شورے بہ جہاں کردی ؛ ہر زخمی و بسمل را معروفِ فغاں کردی

نیز فرمایا ؎

قطرۂ دردِ دلِ جامی بدر دریا در فگن ؛ سینہ سوزاں دل تپاں ماہی ز آب آید برون

ایک صاحب فرماتے ہیں

یارب چہ چشمہ الیست محبت کہ من ازو ؛ یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

حتیٰ کہ حج و طوافِ کعبہ میں بھی دوست کو تلاش کرتے ہیں ؎

اگرچہ من بہوسِ حجر دل را شاد مے کردم ۔۔۔ مسی مالین دندانِ کسے را یاد مے کردم
دریں دار الامان مشتاقِ تیغ قاتلے بودم ۔۔۔ ز بے تابی طوافِ خانۂ صیاد مے کردم

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

عمرے بر آستانِ تو سودم سرِ نیاز ؛ شاید شوم بہ بزمِ وصالِ تو سرفراز۔

نیز فرمایا ؎ تو بمن نوازشے کن دلِ زار و نا توانم
نظرے بکن بسویم کہ زدَود ز دست جانم

نیز فرمایا ؎

اے جانِ جہان آرزوئے روئے تو دارم در سر ہوسِ قامتِ دلجوئے تو دارم
در کعبہ و در صومعہ و در دیرِ خرابات ہر جا کہ روم دل را ہمہ سوئے تو دارم
حاجی بطواف کعبہ رود لیک من کعبۂ مقصود سر کوئے تو دارم

دوئی اور عبدیت کے مقام میں آکر حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر قدس سرہٗ اکثر یہ رباعی پڑھا کرتے تھے ؎

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زِیم خاکے شوم و زیرِ پائے تو زِیم
مقصودِ منِ بندہ ز کونین توئی بہرِ تو میرم و ز برائے تو زیم

مقامِ خوف و رجا بزرگوں نے فرمایا ہے "نزدیکاں را بیش بود حیرانی" (قرب میں رہنے والوں کو زیادہ پریشانی رہتی ہے) کبھی وہ دوست کے ڈر سے رو رو کر دریا بہا دیتے ہیں کبھی عالمِ انبساط میں آکر پھولے نہیں سماتے۔ کسی نے ان دونوں حالتوں کو ایک رباعی میں یوں بیان کیا ہے ؎

ایمن مشو کہ ابلقِ مردانِ زہد را در سنگلاخ بادیہ پے ہا بریدہ اند
نا امید ہم مشو کہ رندانِ بادہ نوش ناگہ بیک خروش بہ منزل رسیدہ اند

(بے فکر نہ ہو کہ زاہدوں کے گھوڑوں کے پاؤں عشق کی سنگلاخ وادی میں کٹ گئے ہیں نا اُمید بھی نہ ہو کیونکہ رندانِ بادہ نوش ایک نعرہ لگا کر منزل پر پہنچ گئے ہیں)

غرضیکہ مقام بقا باللہ میں مقربانِ بارگاہِ قدس کو حق تعالیٰ کی گوناگوں اور بوقلموں تجلیات اور راز و نیاز کے تحت ایسی کیفیات سے گزرنا پڑتا ہے کہ جن کا شمار نہیں۔ نہ حق تعالےٰ کی تجلیات کا شمار ہے نہ عشاق کے درد و اندوہ کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ اگر تمام قسم کے تعلقات اور اسرار و رموز کو بیان کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں وجود میں آجائیں گی۔ یہاں

صرف اس قدر بتا دینا کافی ہے کہ اگران لذّاتِ ہجر و فراق اور قرب و وصال اور معشوقانہ چھیڑ چھاڑ کے مزے اُڑانے ہیں تو اس کوچے میں آکر دیکھیں۔ اس شراب کی لذّت اُس وقت تک آپ محسوس نہ کر سکیں گے جب تک اسے نوشِ جان نہ کریں گے۔ تجلیاتِ الٰہی میں تکرار نہیں اور جانِ بے قرار میں قرار نہیں۔ یہ لذّتیں قبر تک ختم نہیں ہوتیں بلکہ قیامت تک اور قیامت کے بعد بہشت میں عاشقانِ حق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوست کی تجلیاتِ حسن و جمال میں محو و بے خود رہتے ہیں۔ باقی سب لذّات فانی ہیں لیکن لذّتِ وصل ابدی اور باقی ہے۔ لہٰذا عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ عارضی لذّات کی خاطر دائمی لذّات کو ترک نہ کیا جائے اور لطف یہ ہے کہ اسلام میں عارضی لذّات کو بھی ترک کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ترک رہبانیت ہے جو اسلام میں ناجائز ہے۔ دنیا میں رہو لیکن دنیا کے نہ ہو جاؤ۔ یہی اسلامی زندگی کا گُر ہے۔ مولانا رومؒ نے کس خوبی سے یہ سمجھایا ہے ؎

چیست دنیا از خدا غافل بُدن   نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

آب اندر کشتی ہلاکِ کشتی است   آب زیرِ کشتی پشتی است

(وہ دنیا جسے مذموم کہا گیا ہے کیا ہے؟ خدا سے غفلت کا نام ہے نہ کاروبار ہے نہ سونا چاندی ہے نہ بال بچے۔ دنیا پانی کی طرح ہے۔ اگر پانی کشتی کے اندر چلا جائے یعنی انسان کے دل میں گھر کرلے تو کشتی ڈوب جاتی ہے اگر پانی کشتی کے نیچے رہے یعنی اگر دنیا سے صرف سہارا لیا جائے اور دل میں داخل نہ ہونے دیا جائے تو کشتی کا مددگار ہے)

اب آپ نے دیکھ لیا کہ کہاں اسلام کی ہمہ گیری، فنا و بقا، عروج و زوال، قرب و بعد توحید و عبدیت کے مزے اور کہاں دوسرے مذاہب کا دنیا چھوڑ چھاڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں ساری عمر تنِ تنہا رہنا اور تخلیقِ کائنات کی غرض و غایت کو بھول کر اور کارزارِ عالم کے جمیع فرائض سے کوتاہی برتنا اور زندگی کے لطف سے محروم رہنا۔

لذّتِ قرب ایک بزرگ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں پہنچ کر ہمیں اس قدر لذّت محسوس ہوتی ہے کہ اگر شاہانِ عالم کو اس کا علم ہو جائے تو تلوار لے

لے کر ہمارے سر پر آ جائیں گے۔ لذّت کیوں نہ ہو تمام دنیادی لذّات کا احساس لطیفۂ نفس یا قدرے لطیفۂ قلب میں ہوتا ہے لیکن قربِ حق اور حسن و جمالِ ازلی کی لذّت اس سے بلند تر اور قوی تر لطائف یعنی لطیفۂ روح، لطیفۂ سِر، لطیفۂ خفی، اور لطیفۂ اخفیٰ میں محسوس ہوتی ہے اور اس قدر قوی جاذب اور ہوش رُبا ہوتی ہے کہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔

جذبۂ ہیچ مقداری مقام بقا باللہ میں سب سے زیادہ جذبۂ ہیچ مقداری غالب ہوتا ہے اگرچہ حق تعالیٰ کی طرف سے مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ (جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اُس کا ہو جاتا ہے) کا اعلان ہو جاتا ہے اور پوری کائنات بندۂ مومن، مردِ کامل اور عاشقِ صادق کے حوالے کر دی جاتی ہے کیونکہ وہ خلیفۃ اللہ اور نائبِ حق ہوتا ہے لیکن دوسری طرف عجز و انکسار کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بندہ سب کچھ مالکِ حقیقی کے حوالے کر دیتا ہے اور خود بے کس، لاشے، حقیر پُر تقصیر بن کر رہ جاتا ہے حتیٰ کہ اپنے ننگ و ناموس اور جبّہ و دستار اور شان و شوکت کو بھی پاؤں تلے روند دیتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر شمس تبریز قدس سرہٗ چلّا اُٹھے ؎

من خرقہ گرد کردم عریانِ خراباتم
خوردم ہمہ رختِ خود مہمانِ خراباتم

حضرت خواجہ عثمان ہارونی قدس سرہٗ نے یہ نعرہ لگایا ؎

خوشا رندی کہ پامالش کنم صد پارسائی را
زہے تقویٰ کہ من باجبہ و دستار می رقصم

حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

مست گشتم از دو چشمِ ساقی پیمانہ نوش
الوداع اے ننگ و ہستی الفراق اے عقل و ہوش

خاصانِ خدا اپنے آپ کو اس قدر حقیر سمجھتے ہیں کہ دنیا کی حقیر سے حقیر چیز کو بھی اپنے

سے بہتر سمجھتے ہیں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے آپ کو کتے سے بہتر سمجھتا ہے وہ ہماری صحبت سے کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک دفعہ حج کے موقعہ پر عرفات کے میدان میں حضرت فضیل ابن عیاضؒ سے کسی نے پوچھا کہ آج کے دن کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ فرمایا سب کچھ شاندار ہے بشرطیکہ میں یہاں نہ ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب سے حقیر ترین چیز پیش کرو۔ تو آپ نے ایک مرا ہوا کتا اُٹھانے کی کوشش کی۔ کتے میں سے آواز آئی کہ میں بدترین نہیں ہوں میرے اندر تو اولیاء اللہ کے صفات ہیں۔ شب بیدار ہوں، قانع ہوں، مالک کا وفادار ہوں۔ اس کے بعد آپ نے گلا سڑا پاخانہ اُٹھانا چاہا تو اس سے آواز آئی کہ میں بدترین چیز نہیں ہوں۔ میں تو اناج ہوں حضرت انسان کی آٹھ پہر کی صحبت سے اس حالت کو پہنچا ہوں۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کی حضور بدترین چیز لایا ہوں۔ فرمان ہوا کہاں ہے؟ عرض کیا میں ہوں۔ روایت ہے کہ حضرت جنیدؒ بغدادی کے شیخ حضرت سری سقطیؒ دن میں کئی بار آئینہ دیکھتے تھے کہ شاید گناہوں کی وجہ سے مُنہ سیاہ ہو گیا ہو۔

پانچواں باب
تصوف کے خلاف اعتراضات وجوابات

اعتراضات کی نوعیت تصوف کے متعلق دو قسم کے اعتراض ہوئے ہیں ایک وہ اعتراض جو مسلمانوں نے کئے ہیں۔ دوسرے وہ اعتراض جو غیر مسلم مستشرقین ORIENTALISTS نے کئے ہیں۔ مسلمانوں کے عائد کردہ اعتراضات معمولی فروعی قسم کے ہیں جو محض فرقہ وارانہ اختلاف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی قرآن وحدیث کی رُو سے بعض علماء انھیں جائز سمجھتے ہیں اور بعض نا جائز۔ فروعی اختلافات کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ علماء کرام کے جس گروہ کی اقتدا کی جائے درست ہے لیکن جو اعتراضات غیر مسلم یورو پین مصنفین نے کئے ہیں وہ بالکل علیحدہ قسم کے ہیں۔ یہ لوگ نہ قرآن کو خدا کی کتاب سمجھتے ہیں نہ اسلام کو خدا کا سچا مذہب سمجھتے ہیں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا سچا پیغمبر مانتے ہیں اس لئے ان کے اعتراضات زیادہ سخت اور بے بنیاد ہیں اور در اصل یہ اعتراض تصوف کے خلاف نہیں بلکہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف ہیں۔

مسلمانوں کے عائد کردہ الزامات مسلمانوں میں سب سے سخت اعتراض امام ابن تیمیہ اور ان کے مقلدین نے کئے ہیں جن پر ہم ایک نظر پہلے ڈال چکے ہیں۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ امام موصوف کا اعتراض صوفیاء کرام یا تصوف کے

خلاف نہیں کیونکہ تصوّف کے مقامات فنا فی اللہ، بقا باللہ، جمع و فرق، سکر و صحو کو وہ تسلیم کرتے ہیں اور سوائے دو چار صوفیا رکرام کے کہ جن سے کلماتِ شطحیات سرزد ہوئے، باقی سب کی تعریف کرتے ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے وحدت الوجود کی اس لئے تردید کی کہ اس سے اتحاد اور حلول جیسے غیر اسلامی نظریات کی تائید ہوتی ہے لیکن صوفیا رکرام خود تسلیم کرتے ہیں کہ اتحاد اور حلول حرام ہیں اور یہ کہ وحدت الوجود سے اتحادُ حلول لازم نہیں آتے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ امام صاحب کا تصورِ ذاتِ باری تعالےٰ یعنی استویٰ علَی العرش (عرش پر بیٹھنا) کس طرح قرآن وحدیث کے نصوصِ قطعی کے خلاف ہے خدا تعالےٰ ذات وصفات میں غیر محدود ہیں اور ہر جگہ وجود کے ساتھ موجود ہیں نہ کہ صرف علم کے ساتھ۔

اب ہم تصوّف کے خلاف اُن اعتراضات پر مختصر بحث کرتے ہیں جو بعض لوگوں نے فروعات کے میدان میں عائد کئے ہیں۔ مثلاً ایک اعتراض یہ ہے کہ صوفیا رعرس مناتے ہیں، زیارتِ قبور کو جاتے ہیں، سماع سُنتے ہیں، قبروں پر جاکر منّت مانتے ہیں ہیں اور نذریں پیش کرتے ہیں۔ قبروں پر عمارات گنبد وغیرہ تعمیر کرتے ہیں۔ میلاد کرتے ہیں۔ غیر حق سے دعا کرتے ہیں وغیرہ۔

زیارتِ قبور سب سے پہلے ہم زیارتِ قبور کو لیتے ہیں کیونکہ باقی سب امور مزارات پر جاکر سرانجام ہوتے ہیں۔ بنیادی چیز زیارتِ قبور ہے۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر جانے سے صحابہ کو منع فرمایا تھا لیکن بعد میں اجازت مل گئی تھی اور حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی احادیث موجود ہیں کہ جن میں جمعہ کے دن قبروں پر جانے، فاتحہ پڑھنے اور اہلِ قبور کے حق میں دعا مانگنے کی تاکید آئی ہے۔ حافظ ابنِ قیّم نے جو امام ابنِ تیمیہؒ کے شاگرد ہیں اپنی کتاب "کتاب الرّوح" میں لکھا ہے کہ جب آدمی اپنے رشتہ داروں کی قبروں پر جاتا ہے تو اہلِ قبور اس سے خوش ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کسی کے حالات خراب ہوں تو اہلِ قبور اس سے

غمزدہ ہوتے ہیں۔ اہلِ قبور سلام کا جواب دیتے ہیں اور دعا کرنے والوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ابنِ قیم کی اس کتاب میں کثرت سے ایسے واقعات درج ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرتؐ اپنی امّت کے لوگوں کے حالات سے واقف ہوتے ہیں اور خواب میں تشریف لاکر ان کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ غرضیکہ زیارتِ قبور کے متعلق کسی فرقہ کو اختلاف نہیں البتہ امام ابنِ تیمیہ نے حدیث لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا لِثَلَاثَۃِ مَسَاجِدَ (اونٹوں پر کجاوے نہ رکھو سوائے تین مساجد کے) سے ایسا مفہوم نکالا ہے جو بالکل نرالا اور باقی تمام احادیث کے خلاف ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں صرف تین مساجد یعنی بیت اللہ، مسجد نبوی اور مسجد اقصٰی (فلسطین) کی زیارت کے لئے سفر کی اجازت ہے۔ باقی تمام سفر ناجائز اور حرام ہیں اسی بنا پر انھوں نے روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ امامِ وقت نے یہ بات کس طرح کہہ ڈالی۔ جب زیارتِ قبور جائز ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف بذاتِ خود شہدائے اُحد وغیرہ کے مزارات پر ہر سال جاتے تھے بلکہ صحابۂ کرام کو بھی جانے کا حکم دیتے تھے اور زیارتِ قبور کے آداب بھی صحابۂ کرام کو تعلیم کرتے تھے تو پھر حدیث لاتشد الرّحال سے زیارتِ قبور کی کیونکر ممانعت ہوسکتی ہے۔ دراصل اس حدیث کا مطلب یہ ہے سوائے ان تین مساجد کے کسی اور مسجد کی زیارت کی ضرورت نہیں کیونکہ بیت اللہ میں ایک رکعت نماز پڑھنے سے ایک لاکھ رکعت کا ثواب ملتا ہے۔ مسجد نبویؐ میں پچاس ہزار کا اور مسجد اقصٰی میں پچیس ہزار رکعت کا۔ لیکن باقی کسی مسجد میں یہ خصوصیت نہیں۔ اگر اس حدیث کی رو سے صرف ان تین مساجد کا سفر جائز ہے اور باقی تمام سفر حرام ہیں تو پھر تحصیلِ علم کے لئے اونٹوں پر سفر کرنا، ماں باپ، اُستاد یا کسی اور بزرگ کی خدمت میں حاضر ہونا بھی حرام ہے۔ غرضیکہ اس محدود مفہوم سے دنیا کے ہر کام کے لئے اونٹوں پر سفر کرنا حرام ہوتا ہے۔ طرفہ یہ کہ امام صاحب یہ بات تسلیم فرماتے ہیں کہ زیارتِ قبور جائز ہے اور مدینہ اور اس کے گرد و نواح کے لوگوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک

جن کو اونٹوں پر سوار ہو کر آنا پڑتا ہے یہ سفر
کی زیارت جائز ہے لیکن دور کے لئے جن کو اونٹوں پر سوار ہو کر آنا پڑتا ہے یہ سفر حرام ہے۔ کس قسم کا استدلال ہے۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ روضۂ رسول اللہ پر حاضری حرام نہیں بلکہ اونٹوں پر سفر کرنا حرام ہے۔ نیز جب امام موصوف سے لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو اونٹوں پر سوار ہو کر مسجد قبا کو جایا کرتے تھے جو مدینہ سے چھ میل دُور ہے اور جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت قیام فرمایا تھا تو امام صاحب نے فرمایا کہ کیا یہ بھی کوئی سفر ہے جس میں نہ پانی کا بندوبست کیا گیا ہو نہ زادِ راہ جمع کیا گیا ہو۔ یک نشد دو شد۔ اب تو یہ ثابت ہوا کہ نہ روضہ اقدس پر حاضری حرام ہے کیونکہ مدینہ کے لوگ روزانہ حاضر ہوتے ہیں، نہ اونٹوں کا سفر حرام ہے کیونکہ آنحضرتؐ نے اونٹوں کا سفر ایک چوتھی مسجد کے لئے فرمایا۔ حرام ہے تو زادِ راہ لینا حرام ہے۔ ایک امام وقت کا یہ استدلال اور اندازِ فکر ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا، البتہ ابنِ بطوطہ نے جو ایک مشہور سیاح ہیں جو بات کہنی تھی کہہ دی۔

ابنِ بطوطہ کی امام ابنِ تیمیہ کے متعلق رائے

ابن بطوطہ لکھتے ہیں کہ جب میں دمشق پہنچا تو مجھے امام ابن تیمیہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شوق ہوا۔ چنانچہ میں آپ کی مسجد میں گیا جہاں آپ ممبر پر کھڑے تقریر کر رہے تھے۔ موضوعِ گفتگو یہ تھا کہ آخر شب اللہ تعالےٰ پہلے آسمان پر تشریف لا کر فرماتے ہیں کہ کوئی ہے جو مجھ سے کوئی چیز طلب کرے تاکہ اُسے عطا کروں۔ اس پر ایک شخص نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح پہلے آسمان پر اُتر آتے ہیں؟ امام صاحب نے ممبر سے اُتر کر فرمایا کہ اس طرح۔ ابنِ بطوطہ کہتے ہیں کہ یہ بات دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالےٰ نے امام صاحب کو عقل سے زیادہ علم دیا ہے کیونکہ داناؤں کا مقولہ ہے کہ یک من علم را دہ من عقل باید (ایک من علم کے لئے دس من عقل کی ضرورت ہے) لیکن جب عقل سے علم زیادہ ہو تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بہرحال یہ رائے ابنِ بطوطہ کی ہے ہم تو چھوٹے منہ سے بڑی بات نہیں نکال سکتے۔ اسی طرح آپ نے سابقہ باب میں دیکھ لیا کہ امام موصوف نے آیۂ الرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی

(رحمٰن عرش پر مقیم ہے) کے وہ معنی نکالے جو قرآن مجید کی دس دوسری آیات کے خلاف ہیں اور یہ مفہوم آپ نے اِس لئے لیا کہ نظریۂ حلول کی تردید ہوسکے جو بقول اُن کے مسئلۂ وحدت الوجود سے لازم آتا ہے حالانکہ صوفیاء کرام نے بار بار کہا ہے کہ حلول حرام ہے اور وہ حلول کو قطعاً حرام قرار دیتے ہیں۔ صوفیا نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ وحدت الوجود سے حلول لازم نہیں آتا۔ ابن عربیؒ بار بار کہہ چکے ہیں کہ ؎

اَلْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَعَرَّجَ
وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ

(عبد عبد ہے خواہ وہ کتنا عروج کرے اور رب رب ہے، خواہ وہ کتنا نزول فرمائے)

لیکن پھر بھی امام موصوف وحدتِ وجود کی تردید اور اللہ کے عرش پر مقیم ہونے پر قائم رہے جس سے اللہ تعالٰی کے لئے تجسیم یعنی جسم ہونا لازم آگیا حالانکہ اللہ تعالٰی جسم سے پاک ہیں۔ نیز اس سے اللہ تعالٰی کی ذات وصفات کا محدود ہونا بھی لازم آگیا حالانکہ اللہ تعالٰی ذات وصفات میں لامحدود ہے۔ ذاتِ لامحدود کو محدود کرنا کفر ہے۔ امام موصوف نے جب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی زیارت کو حرام قرار دیا ہے اور اللہ تعالٰی کو جسم کے ساتھ عرش پر بٹھا کر محدود کر دیا تو ساری اسلامی دنیا میں ایک ہیجان مچ گیا۔ اور ہر خاص وعام آپ کے خلاف برانگیختہ ہوگیا چنانچہ بادشاہِ وقت نے آپ کو قید کر دیا۔ اس کے بعد آپ کے جانشینوں نے ان عقائد کی ترویج جاری رکھی اور اسلامی دنیا میں اس وجہ سے بے حد تشویش اور نفاق پیدا ہوا حتیٰ کہ پچھلی صدی میں جب محمد ابن عبدالوہاب نجدی نے از سرِ نو امام ابنِ تیمیہ کی تعلیمات کو نئے جوش وخروش سے پھیلانے کی کوشش کی تو تصادم تک نوبت پہنچ گئی جس سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا حالانکہ محمد ابن عبدالوہاب کے والد اور بھائی دونوں اُن عقائد کے خلاف تھے۔ یہاں تک کہ ان کے بھائی نے ان کی تردید میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ بہرحال امام ابنِ تیمیہ کے وقت سے آج تک اسلامی دُنیا اس ہیجان کا شکار ہے۔

مسلمانوں کی طرف سے تصوف پر باقی الزامات

زیارتِ قبور جیسے بنیادی مسئلہ کا جواز معلوم کر لینے کے بعد اب ہم باقی الزامات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو یہ ہیں قبروں پر منّت ماننا، غلاف چڑھانا، فاتحہ دینا، قوالی سُننا، عرس منانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے امور ہیں جو علمائے کرام کے نزدیک اختلافی مسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کے اختلافات فروعی کہلاتے ہیں نہ کہ اصولی۔ اور فروعی اختلافات میں علمار کرام کا فتویٰ یہ ہے کہ جس مسلک کو اختیار کیا جائے جائز ہے کیونکہ تمام فرقوں کے علمار قرآن و حدیث سے سند لیتے ہیں اور قرآن و حدیث میں اتنی لچک موجود ہے کہ جس سے طبائع اور مختلف رجحانات کی تسلی ہو سکے۔ نیز اس بات پر بھی علمائے اُمت کا اتفاق ہے کہ فروعی اختلاف میں اگر علمار کا کوئی گروہ غلطی پر ہو تو وہ اجتہادی غلطی ERROR OF JUDGEMENT کہلاتی ہے جس پر کوئی گرفت نہیں۔ اب چونکہ صوفیار کرام جن میں اکثر و بیشتر علم شریعت میں ماہرین کی حیثیت رکھتے ہیں عرس منانے، فاتحہ دینے، نذر نیاز دینے غلاف چڑھانے اور سماع سُننے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی سند قرآن و حدیث سے لیتے ہیں اس لئے عوام کے لئے ان حضرات کے فتویٰ پر عمل کرنا جائز ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خود صوفیار کرام میں سے بعض حضرات ایسے ہیں جنہوں نے احتیاط کا پہلو اختیار کرتے ہوئے عرس منانے منّت ماننے اور فاتحہ دینے جیسے کاموں کو ناجائز قرار دیا ہے مثلاً شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی جن کے صوفی ہونے میں کسی کو شک نہیں ایک طرف تو اپنی کتاب "تحفۃ الموحّدین" میں اس رسومات کو ناجائز کہتے ہیں اور دوسری طرف اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" اور "فیوض الحرمین" وغیرہ میں تصوف کے بلند ترین مقامات اور منازل بیان کر رہے ہیں۔ اسی طرح قاضی ثنا اللہ پانی پتی ؒ نے اپنی کتاب "ارشاد الطالبین" میں سلوک الی اللہ اور اصول تصوف کے ساتھ ساتھ عرس منانے اور منّت ماننے، سماع سُننے وغیرہ کو بھی ناجائز کہا۔ مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کی کتابوں میں بھی دونوں رنگ پائے جاتے ہیں جہاں "بہشتی زیور" جو عورتوں اور بچیوں کے لئے مخصوص ہے۔ آپ نے

مزارات پر جانے اور غیر شرعی امور سے منع کیا ہے وہاں آپ کی دوسری کتابوں مثل "تکشف" "بوادر النوادر" اور "شمائم امدادیہ" وغیرہ میں تصوّف بھرا پڑا ہے حضرت غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی کتابوں میں بھی عوام اور خواص کے لئے علیحدہ علیحدہ قسم کے مضامین پائے جاتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے اس قسم کے جو اعتراضات صوفیاء کرام پر یا تصوّف پر ہوئے وہ ایسے کوئی بنیادی یا اصولی اعتراض نہیں ہیں بلکہ معمولی فروعی اختلاف پر مبنی ہیں اور خود صوفیاء کرام کے محتاط گروہ نے وہی اعتراض کئے ہیں۔ لہٰذا یہ اعتراضات تصوّف کے خلاف نہیں بلکہ غیر محتاط لوگوں کے خلاف ہیں۔

غیر مسلم یورپی مصنفین کے اعتراضات

غیر مسلم یورپی مصنفین نے جو اعتراض تصوّف اور صوفیاء اسلام کے خلاف کئے ہیں وہ دراصل اسلام قرآن اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ بابرکات کے خلاف ہیں کیونکہ یہ لوگ نہ اسلام کو خدا تعالیٰ کا سچا دین مانتے ہیں نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کا سچا نبی تسلیم کرتے ہیں نہ قرآن کو خدا تعالیٰ کا کلام سمجھتے ہیں۔ اِس لئے جب انھوں نے تصوّف کا جائزہ لیا تو اِسی نقطۂ نگاہ سے لیا کہ چونکہ اسلام نعوذ باللہ ایک مصنوعی مذہب تھا اِس لئے روحانیت سے خالی تھا۔ لہٰذا جب مسلمانوں نے دیکھا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ روحانی دولت سے مالا مال ہیں اس لئے انھوں نے اسلام کو ترک کر کے ان مذاہب سے روحانیت کا علم سیکھا۔ آنکھوں میں مٹی ڈالنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ یہ اتنا بڑا جھوٹ ہے کہ جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی جب دل میں ایک بنیادی غلطی گھر کر جائے تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں اس پر کونسی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رَوَد دیوار کج

(جب معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھ لے تو آسمان تک دیوار ٹیڑھی جائے گی)

دیوار جائے گی کہاں وہ تو فوراً گر جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے تصوف کے متعلق جتنے غلط نظریات THEORIES قائم کئے ہیں وہ ایک دوسرے کی تردید کر کے سب ختم ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے کم سمجھ مسلمان پھر بھی نہیں سمجھتے۔ پہلے جب کبھی غیر مسلم اسلام کے خلاف اعتراض کرتا تھا تو مسلمان اُسے بیہودہ اور لغو سمجھ کر پاؤں کے نیچے روند دیتے تھے لیکن اب جبکہ اقوام مغرب نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں سبقت حاصل کر کے مسلمانوں کے دلوں میں احساس کمتری INFERIORITY COMPLEX پیدا کر دیا ہے ہمارے سادہ لوح اور اسلام سے بے خبر مسلمان بھائی اہل مغرب کی ہر بات کو سچ سمجھنے لگے ہیں اور اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف بیہودہ اور بے بنیاد الزامات کو بھی سائنس کی معلومات کی طرح ریسرچ کا نتیجہ خیال کرنے لگے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جس نے اسلام اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے کیونکہ احساس کمتری سے پیدا شدہ اس بدترین انداز فکر کی وجہ سے مغربیت کا الحاد، بے دینی، بدتمیزی کا طوفان دنیا کے گوشے گوشے اور گھر گھر میں گھس چکا ہے جس کے نکالنے کے لئے کئی صدیوں کی محنت کی ضرورت ہوگی بشرطیکہ پہلے ہم اس کی تباہ کاریوں سے آگاہ ہو کر تہِ دل سے اسے اپنے گھروں اور دلوں سے نکالنے کی نیت کر لیں لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ابھی مسلمان لوگ یہ نیت ہی نہیں کر پائے اور شش و پنج میں مبتلا ہیں۔ نیت درست کرنے کی خاطر ہمیں اسلامی تاریخ، اسلامی فتوحات اور علوم و فنون اور سائنس کے میدان میں اسلامی ترقی کے کارنامے پڑھنے کی ضرورت ہے

معترضین کے طبقات

یاد رہے کہ جن غیر مسلم لوگوں نے تصوّف یا اسلام کے خلاف الزامات کے طومار باندھے ہیں ان کو مختلف طبقات یا اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا گروہ تو ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو کٹر قسم کے متعصب اور مذہبی دیوانے ہیں وہ اسلام کی ہر چیز کو برا اور اپنے مذہب کی ہر چیز کو اچھا ثابت کرنے کے لئے جھوٹے اور بے بنیاد اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے

جو سیاسی اغراض کی خاطر ہر بات میں عیسائی مذہب کی اسلام پر برتری اور فوقیت ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں احساس کمتری پیدا ہو اور اقوام مغرب کا اقتدار ہمیشہ کے لئے قائم رہے تیسرا گروہ وہ ہے جو حقیقی غلط فہمی GENUINE MISUNDERSTANDING کا شکار ہے۔ چوتھا گروہ ایسے اعتدال پسند اور منصف مزاج مصنفین کا ہے جنہوں نے تحقیقات اور ریسرچ سے ثابت کر لیا ہے کہ تصوف کی بنیاد قرآن و حدیث ہے اور اسلام خدا کا سچا مذہب ہے۔

تصوف کے متعلق چار نظریات

ان لوگوں نے تصوف کی اصل کے متعلق چار نظریات قائم کر لئے ہیں پہلا نظریہ یہ ہے کہ تصوف عیسائی مذہب سے ماخوذ ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ تصوف کی اصل فلسفۂ یونان ہے۔ تیسرا نظریہ تصوف کی اصل ہندو فلسفہ ویدانت بدھ مت بتاتا اور چوتھا نظریہ یہ ہے کہ تصوف قرآن و حدیث پر مبنی ہے اور اسلام اور تصوف میں کوئی فرق نہیں۔ اب ہم ان نظریات پر محققانہ انداز سے بحث کریں گے۔

غلط فہمیوں کی وجہ

سب سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تصوف کے متعلق ان لوگوں کو اس لئے غلط فہمی ہوئی کہ لفظ تصوف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں مروج نہ تھا۔ بعض سطحی نظر رکھنے والے مسلمان بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تصوف کا تعلق اسلام سے ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کا وجود ہوتا۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں تو دوسرے اسلامی علوم مثل تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ معانی۔ بیان۔ صرف و نحو وغیرہ علوم کا بھی تو وجود نہیں تھا۔ کیا یہ علوم غیر اسلامی ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں جامعیت تھی۔ آپؐ کے عہدِ مبارک میں سب لوگ سب علوم سے بہرہ ور تھے لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور زمانۂ نبویؐ سے دوری کی وجہ سے لوگوں کے ایمان اور ہمت میں کمی آنے لگی تو اسلام کے تمام شعبہ جات میں جامعیت یعنی ہر فن مولا

ہونے کی بجائے مسلمانوں نے اپنی اپنی طبائع کے مطابق کسی ایک یا ایک سے زیادہ علم کو اپنانا شروع کیا۔ بعض نے علم تفسیر میں مہارتِ تامہ حاصل کی، بعض نے حدیث میں، بعض نے فقہ میں بعض نے روحانیت میں۔ جن حضرات نے علم تفسیر میں کمال حاصل کیا وہ مفسرین کے نام سے موسوم ہوئے۔ جنہوں نے علم حدیث میں مہارت حاصل کی وہ محدثین کہلائے۔ جنہوں نے علم فقہ کو اپنایا ان کا نام فقہا ہوا اور جن حضرات نے روحانیت میں مہارت حاصل کی وہ صوفی (جمع صوفیا) کے نام سے موسوم ہوئے۔ لیکن امتِ محمدیہ میں اکثر علماء ایسے گذرے ہیں جو تمام اسلامی علوم میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔

صوفی کی وجہ تسمیہ صوفی کی وجہ تسمیہ میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ علم روحانیت کے ماہرین اس لئے صوفی کہلاتے تھے کہ وہ صوف یعنی اون کے کپڑے پہنتے تھے۔ بعض کے نزدیک لفظ صوفی صفّہ سے نکلا ہے چونکہ ان حضرات کا مسلک اصحابِ صفّہ جیسا تھا اس لئے ان کو صوفی کہا گیا۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ لفظ صوفی کا مصدر صفا ہے یعنی صفائے باطن۔ بہرحال وجہ تسمیہ کچھ ہو تصوف کی اصل مرتبہ احسان ہے جس کی وضاحت اس حدیث میں کی گئی ہے کہ جب صحابۂ کرام نے آں حضرت سے احسان کا مطلب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کی جائے کہ گویا آدمی اللہ کو دیکھ رہا ہے اگر دیکھ نہیں سکتا تو یہ سمجھ لے کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

اسلام کی عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد اور تمام کارہائے خیر کی غرض و غایت یہ ہے کہ ان عبادات اور مجاہدات کے ذریعے نفس کو بری عادتوں مثلاً حرص، لالچ، تکبّر، ظلم، غیبت، ریا، دھوکہ بازی، چوری، زنا وغیرہ سے پاک کرکے اس کے اندر اچھی صفات مثل ایثار و محبت، رواداری، خیر خواہی، صبر و شکر، علم و حیا، قناعت، توکل، بے غرضی خدا ترسی، عدل و انصاف جیسی صفات پیدا کی جائیں جس سے روح میں کثافت کی بجائے لطافت آ جائے اور اس کی قوتِ پرواز میں اس قدر ترقی ہو کہ اللہ تعالیٰ تک اس کی رسائی ہو سکے۔ یہ ہے منصبِ نبوت کا خلاصہ جس کا تعین اس آیۂ مبارک میں کیا گیا یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ

اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ ۔(رسول خدا کا کیا کام ہے (۲) لوگوں کو اللہ کا کلام پڑھ کر سناتے ہیں (۲) ان کا تزکیۂ نفس کرتے ہیں (۳) ان کو اسلامی تعلیمات پر عمل کراتے ہیں (۴) جس کے بعد ان کو کائنات اور خالق کائنات کے حقائق اور رموز سے آگاہی ہوتی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں مشائخ عظام بھی اسی طریقے سے اپنے مریدین کی تربیت کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تمام ہدایات کا سرچشمہ قرآن اور سنّت نبویؐ ہے اور تمام صوفیائے کرام اسی سرچشمہ سے سیراب ہوتے ہیں اور مریدین کو سیراب کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے جن غیر مسلم مصنّفین نے صوفیائے کرام اور تصوف کے خلاف الزامات لگائے ہیں سب بے بنیاد ہیں۔ ان میں سے اکثر اعتراضات تو شرارت کی بنا پر کئے ہیں اور باقی لاعلمی کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو محقق تو بتاتے ہیں لیکن ان کی ریسرچ اس قدر بودی ہے کہ دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔

نکلسن جیسے محقق کی بودی ریسرچ

نکلسن کے معیار عقل و فہم اور تحقیق RESEARCH کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوتا ہے کہ مولانا رومؒ کے ایک شعر کا ترجمہ کرتے ہیں اور اس شعر میں مولائے حضرت علیؓ کی تعریف کی ہے۔ یہ دیکھ کر نکلسن صاحب لکھتے ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک سنّی عالم ایک شیعہ لیڈر (حضرت علیؓ) کی تعریف کر رہا ہے۔ کیا کہنے کیسی محققانہ بات کی ہے۔ اس تحقیق پر تو ہمارے گلی کوچوں کے لڑکے بھی ہنس دیں گے۔

ڈاکٹر نکلسن کی ابتدائی کتابوں میں یہی انداز بیان رہا اور تصوف کے خلاف بے بنیاد باتیں بناتے رہے۔ یہ دیکھ کر ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر آربری سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے اپنے استاد کی خدمت میں ایک پرزور خط لکھا جس میں ان کے غلط الزامات کی تردید کی گئی اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ اب تک اہل مغرب کی ریسرچ اس قدر مکمل نہیں ہوئی کہ جس سے تصوف کی اصلیت ORIGIN کے متعلق صحیح رائے قائم کی جاسکے۔ اس خط کا ان پر بہت برا اثر ہوا اور خط کے جواب میں تسلیم کیا ہے کہ واقعی میں غلطی پر تھا۔ اس

جواب کی تفصیلات سے ناظرین کو آگاہ کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے اس اثناء میں فرانس کے مایۂ ناز ہمعصر ادیب جس کا نام لوئی میسینو LOI MASSIGNON ہے نے حسین ابن منصور الحلاج پر بڑی جانفشانی سے ریسرچ کی اور بغداد جاکر قدیم صوفیاء کرام کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ خود ابن منصور کی کتابیں پڑھیں اور ان کا ترجمہ بھی فرانسیسی زبان میں کیا۔ انھوں نے ابن منصور کی سوانح حیات بھی لکھی ہے۔

غرضیکہ سیکنڈ ہینڈ SECOND HAND اور THIRD HAND تھرڈ ہینڈ معلومات پر اعتماد کرنے کی بجائے جو ان "محققین" کا شیوہ ہے میسینو نے فرسٹ ہینڈ FIRST HAND معلومات حاصل کیں اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ تصوف کی ہر چیز یہاں تک کہ شطحیات (بظاہر غیر شرع کلمات مثلاً انا الحق) بھی قرآن اور حدیث پر مبنی ہیں۔ حلاج پر جو انھوں نے کتاب لکھی ہے اس کا نام لا پیشن دی ڈی حلاج LA PASSION DE ALHALLAJ ہے اور ان کی جس کتاب کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے اس کا نام کتاب الطواسین ہے۔

ڈاکٹر نکلسن کا آربری کو جواب پروفیسر آربری کے احتجاج اور میسینو کی زبردست ریسرچ کے بعد ڈاکٹر نکلسن نے جو جواب اُن کو لکھا اس کا خلاصہ یہ ہے:

"مجھے اس بات پر اصرار نہیں کرنا چاہیئے کہ یونانی فلسفہ یا کوئی اور چیز تصوف کا ماخذ ہے۔ اگرچہ مجھے سر عبداللہ سہروردی سے شرفِ ملاقات حاصل نہیں ہوا، تاہم میں نے ان کی تحریکات اور تصنیفات کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اُنھوں نے اپنے کردار اور اپنی تصنیفات کے ذریعہ سے اسلام کی اُس عظمت کا اہلِ یورپ کو قائل کیا ہے کہ جسے وہ صدیوں کی غلط فہمیوں، کشیدگیوں اور لاعلمی کی وجہ سے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر اُنھوں نے احادیثِ نبوی کا جو انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اس کا اہلِ یورپ

اور خاص طور پر روس کے مایۂ ناز مصنف ٹالسٹائے TOLSTOY پر اتنا گہرا اثر ہوا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی روحانی اور دنیاوی حکمت کا وہ لاانتہا خزانہ جو آج تک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ اب تمام بنی نوع انسان کا مشترکہ سرمایہ بن کر منظرِ عام پر آگیا ہے۔ تصوّف اور صوفیا کے متعلق ہمیشہ مجھے یہی نظر آتا تھا کہ قرآن اور حدیث کی ڈبل بنیاد کے بغیر اسلامی تصوف کی یہ وسیع اور خوبصورت عمارت نہ کھڑی کی جاسکتی تھی نہ قائم رہ سکتی تھی پیغمبرِ اسلام کا وہ فقر جس سے آپ فخر محسوس کرتے تھے (الفقرُ فخری ۔حدیث) دراصل روحانی فقر تھا جس میں آپ کو اللہ کے سوا کسی مادی چیز پر بھروسہ نہ تھا تصوّف کے متعلّق بعض لوگوں نے کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے یہ سب غیر تسلّی بخش ہے۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ اس وقت ہماری معلومات اس قدر محدود ہیں کہ مکمل تو بجائے خود جزوی طور پر بھی تصوف کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا مسّینو کی کتاب لاپیشن — LA PASSION DE ALHA LLAJ — کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ جن دستاویزات کی بنیاد پر انھوں نے یہ کتاب لکھی ہے وہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک تصوف کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ مسّینو کی طرح جانفشانی سے کام لے کر اسلامی کتب خانوں میں نہ گھس جائے اور ان غیر مطبوعہ کتابوں کا مطالعہ نہ کرے جن کا مسّینو نے کیا۔ دراصل مسّینو کا یہ کارنامہ ہماری رائے میں ایک ٹیسٹ کیس TEST CASE ہے۔

آربری کی مسینو کے متعلق رائے

پروفیسر آربری اپنی کتاب "تاریخ تصوف" کا تعارف INTRODUCTION TO HISTORY OF SUFISM. میں لکھتے ہیں کہ:۔

"صرف یہ کہہ کر چھوڑ دینا کہ تصوف پچنجلی کے گیان دھیان سے ماخوذ ہے
کافی نہیں ہے۔ یہ نظریہ تسلیم کرنے سے پہلے یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ
تاریخ کے اُس دور میں اسلام اور ہندوستان کے درمیان خیالات کا لین دین
ممکن بھی تھا یا نہیں۔ میتینو نے اسی کسوٹی پر باقی تمام نظریات مثل تصوف پر
ایرانی اثر، آریہ اثر، یہودی اثر، عیسائی اثر، یونانی اثر کو پرکھا ہے اور آخر
میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ تصوف کی اصل قرآن ہے جس کو مسلمان بار بار پڑھتے
ہیں، جس پر وہ مسلسل غور و خوض کرتے ہیں اور جس پر وہ مسلسل عمل پیرا ہیں۔
قرآن ہی سے تصوف کی ہر چیز یہاں تک کہ شطحیات (ظاہراً غیر شرعی کلمات) نکلی ہے
اور آگے چل کر ترقی پذیر ہوئی ہے۔ قرآن کے علاوہ احادیث نبوی میں بھی بلکہ
احادیثِ قدسی میں تصوف کا پتہ چلتا ہے۔"

آربری اور آسن پلے سیوس | کتاب مذکور میں پروفیسر آربری لکھتے ہیں کہ اندلس SPAIN
کے مشہور مصنف آسن پلے سیوس ASIN PLACIOS
کا خیال تھا کہ تصوف کی اصل عیسائی مذہب ہے۔ اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے اُنھوں نے
قرآن کی چند ایسی آیات کا ذکر کیا ہے جو انجیل کی آیات سے ملتی جلتی ہیں۔ پلے سیوس کا
خیال ہے کہ پیغمبر اسلام نے یہ چیز انجیلِ مقدس کے بانی حضرت عیسیٰ ؑ سے حاصل کی ہے۔
یہاں قارئینِ کرام دیکھ سکتے ہیں کہ پلے سیوس کے نزدیک قرآن عظیم اللہ کا کلام نہیں بلکہ
پیغمبر اسلام ؐ کا کلام ہے۔ بہرحال آربری نے پلے سیوس کی پرزور تردید کی ہے اور لکھا ہے
کہ قرآن اور انجیل میں مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ دونوں مذاہب کی روحانی اور اخلاقی تعلیمات یکساں
ہیں۔ جب خدا ایک ہے حقیقت ایک ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ مشابہت نہ ہو۔ آگے
چل کر آربری لکھتے ہیں کہ اسلام کی ہر اچھی چیز کو دوسرے مذاہب سے منسوب کرنے کی عادت
غیر مسلم مصنفین کے لئے بد دیانت صحافت — DISHONEST SCHOLAR
— SHIP بلکہ بدترین قسم کا مذہبی تعصب (WORST FORM OF

SECTARIAN BIGOTRY) ہے۔ بہترین قسم کا استدلال وہ ہے جو سائنٹفک تحقیق SCIENTIFIC THOROGHNESS پر مبنی ہے۔ آگے چل کر آربری لکھتے ہیں کہ پلے سیوس نے اپنی کتاب اسلام اور ڈیوائن کامیڈی ISLAM AND DEVINE COMEDY لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے DANTE کی کتاب کامیڈیا ڈیوائنا — COMEDIA DI-VINA — کی اصل ابنِ عربی کی تصنیف فتوحاتِ مکیہ ہے۔ آربری کہتے ہیں کہ یہ کتاب لکھ کر پلے سیوس نے اپنے تمام سابقہ نظریات پر پانی پھیر دیا ہے۔ یعنی یہ ثابت کیا ہے کہ عیسائی لوگ مسلمانوں سے سیکھ رہے تھے نہ کہ مسلمان عیسائیوں سے۔ آربری لکھتے ہیں کہ یہ ایک ایسی مثال ہے کہ جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ دریا کس طرف بہہ رہا تھا۔ آربری کہتے ہیں کہ مثال کے طور پر سپین کے سینٹ جان آف کراس ST. JOHN OF THE CROSS کی نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ انھوں نے ہسپانیہ کے مسلم صوفیا سے استفادہ نہ کیا ہو۔ آربری لکھتے ہیں کہ اسی طرح کیٹیلان ریمانڈ لُل CATALAN RAYMOND LULL کا کلام دیکھ کر اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ وہ صوفی نظریات سے متاثر ہوئے تھے کیونکہ وہ عربی زبان کے ماہر تھے اور انھوں نے روم میں علومِ شرقیہ کی ایک درسگاہ قائم کی تھی۔

آگے چل کر آربری اپنے اُستاد ڈاکٹر نکلسن کی یہ رائے نقل کرتے ہیں :-

جہاں تک علم روحانیات کا تعلق ہے اہلِ مغرب اب بھی اسلام سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس بات کا صحیح اندازہ تو نہیں ہو سکتا کہ اہلِ مغرب نے قرونِ وسطیٰ MIDDLE AGES میں اسلامی فلسفہ اور سائنس سے جو سپین کے اسلامی مراکز سے نکل کر عیسائی یورپ کو منور کر رہا تھا کس قدر افادہ کیا لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ افادہ یقیناً بہت عظیم تھا کیونکہ یہ ناممکن تھا کہ مسلم صوفیا کا عیسائی اکابرِ روحانیات مثلاً اکوئناس THOMAS AQUINAS، ایکہارٹ ECKHART

اور ڈانٹے DANTE پر کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ اس وجہ سے کہ اس
زمانے میں دونوں مذاہب کا ذریعہ اتصال علم روحانیت ہی تھا۔"

ڈی۔ بی میکڈانلڈ کی رائے

انگلستان کے مشہور متعصب عیسائی مشنری ڈ۔ بی میکڈانلڈ D.B. MACDONALD. بھی لکھتے ہیں کہ ٹامس ایکوئناس پر امام غزالیؒ کا گہرا اثر ہوا۔

تحریکِ گلڈز اور اسلام

آربری لکھتے ہیں کہ "یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ اسلامی تحریک فتوی جس کا تصوف سے گہرا تعلق ہے یورپ کی تحریک گلڈز GUILDS پر بہت حد تک اثر انداز ہوئی۔ روم۔ لیڈن۔ لنڈن اور آکسفورڈ کی درسی کتابیں عربی زبان میں شائع کی جاتی تھیں اور ان تمام یورپین یونیورسٹیوں میں عربی زبان کی تعلیم کا پورا بندوبست تھا۔"

جرمنی میں جماعت اولیاء اللہ کا قیام

جرمنی کے مشہور و معروف روحانی پیشوا ایکہارٹ ECKHART نے امام غزالیؒ اور دیگر صوفیائے اسلام سے متاثر ہو کر جرمنی میں ایک جماعت قائم کی جس کا نام انھوں نے اولیاء اللہ رکھا۔ ان کے عقائد بھی اسلامی عقائد سے ملتے جلتے تھے۔ لیکن اس بات کو عیسائی علماء نے پسند نہ کیا جس کی وجہ سے ایکہارٹ پر مقدمہ چلا کر انھیں قید کر دیا گیا۔ ان واقعات کی بناء پر بعض لوگوں کا خیال ہے ایکہارٹ مسلمان ہو گئے تھے۔ اسی طرح جب نپولین بوناپارٹ نے فتح یورپ کے بعد مصر کو فتح کیا تو وہاں کے مسلم صوفیائے کرام کو مل کر بہت متاثر ہوا اور جب فرانس واپس گیا تو صوفیاء کی ایک جماعت کو ساتھ لے گیا تاکہ اہلِ فرانس کو اسلامی روحانیت کی تعلیم دیں۔

ولیم جونز

ولیم جونز WILLIAM JONES. جس نے سب سے پہلے کلکتہ میں علوم مشرق کا مرکز قائم کیا اور سنسکرت کا بھی ماہر تھا۔ اس کا خیال ہے کہ صوفیائے متاخرین اور ہندو فلسفۂ ویدانت میں کافی مشابہت ہے۔ اس کے متعلق

پروفیسر آربری لکھتے ہیں کہ ولیم جونز کا تصوف کا علم صرف صوفیائے ایران تک محدود ہے۔ اُسے صوفیائے عرب کی تصانیف دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا اور یہی وہ مواد ہے کہ جس سے تصوف کی اصل کے متعلق حقیقی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ تصوف پر ہندو اثر کے قائل ہیں انھوں نے حقیقی تصوف دیکھا ہی نہیں۔

سر جان میلکم

کتاب مذکور میں آربری نے سر جان میلکم — SIR JOHN MALCOLM — کے اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ منصور اور شمس الدین تبریزی کا تصوف عیسائی نظریۂ تثلیث TRINITY کے مشابہ ہے۔ آربری جان میلکم کی اس بات کو بڑی جسارت تصور کرتے ہیں۔ اور آگے چل کر کہتے ہیں کہ جان میلکم نے صوفیا کے جن حالات اور سلاسل کے متعلق معلومات درج کی ہیں وہ بھی بعید از حقیقت ہیں۔

تصوف اور گوئٹے

اس ضمن میں آربری لکھتے ہیں کہ ایران کی صوفیانہ شاعری نے تو اُلٹا فرانس اور جرمنی کے مفکرین و شعرا کو متاثر کیا جن میں سے گوئٹے GOETHE جو جرمنی کے مشہور اور ہر دلعزیز شاعر ہیں اور فرانس کے سلوسٹر ڈی سیکی SILVESTER DE SACY قابلِ ذکر ہیں۔ سلوسٹر تو تصوف کے بڑے مداح تھے اور ان کی صوفیانہ شاعری کا گوئٹے پر گہرا اثر ہوا۔

تھالک

کتاب مذکور میں آربری لکھتے ہیں کہ اٹلی کے مشہور ادیب تھالک F. R. D THOLUCK نے اپنی کتاب SUFISMUS SIVE THEOLOGIA صوفیسمس میں یہ ثابت کرنے کے لئے بڑا زور لگایا کہ تصوف مجوسی مذہب سے متاثر ہوا لیکن بری طرح ناکام ہوا۔ اور بالآخر یہ خیال ترک کر کے اُسے اس نظریہ پر آنا پڑا کہ تصوف کی اصل عربستان ہے۔ یہاں تک کہ منصور کے فلسفۂ فنا فی اللہ کے متعلق بھی تھالک کا اب یہ نظریہ ہے کہ یہ بھی پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پیش کرتا ہے لِیْ

مَعَ اللہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ نَبِیٌّ الْمُرْسَلُ وَمَلَکُ الْمُقَرَّبُ (مجھے اللہ تعالےٰ کے ساتھ وہ وقت نصیب ہوتا ہے کہ نہ وہاں کسی نبی مرسل نہ مقرب فرشتے کی رسائی ہو سکتی ہے) آخر میں بھالک اپنا پکا اور آخری فیصلہ یہ دیتا ہے کہ تصوف کی بنیاد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اپنی روحانیت ہے۔"

فان کریمر الفریڈ فان کریمر ALFRED VON KREMER نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ تصوف عیسائی اور بدھ مذہب سے متاثر ہوا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ منصور کا انا الحق ہندوستانی فلسفہ کا نتیجہ ہے جو ایران کے راستے عرب پہنچا اور یہی حضرت علیؓ کی شیعہ تحریک کا مقصد ہے۔ چہ خوب! کریمر نے یہ معلوم کرنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی کہ جس زمانے میں منصور نے نعرۂ انا الحق لگایا اُس وقت عرب اور ہندوستان میں کوئی تعلق پیدا ہی نہیں ہوا تھا نیز حسین بن منصور خالص عرب تھے اور عربی کے سوا دوسری زبانوں خاص کر ہند کی سنسکرت زبان سے ناواقف تھے نیز اس زمانے میں ایران پر بھی عربی تصوف اور عربی تمدن اور مذہب کا اتنا اثر تھا کہ ایران کے تمام صوفیاء کرام اسلام کے دلدادہ اور شریعتِ اسلام پر فریفتہ تھے۔ فان کریمر نے اپنی معلومات کی بنیاد سہروردی مقتول کے فلسفہ حکمت الاشراق پر رکھی ہے لیکن سہروردی مقتول کو شہید ہی اس لئے کیا گیا کہ تمام صوفیا کرام اور علماء وقت نے ان کی تعلیمات کو ملحدانہ قرار دیا تھا۔ باقی تمام صوفیاء کرام کا امن و امان اور عزّت و وقار سے رہنا اور صرف سہروردی کا قتل کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تصوف کی وجہ سے نہیں بلکہ غیر شرعی نظریات کی وجہ سے قتل ہوئے۔

پروفیسر براؤن آربری لکھتے ہیں کہ براؤن BROWNE ایسے محقق ہیں جو تصوف کی تہ تک پہنچ چکے ہیں۔ براؤن کے نزدیک اُمّ صوفیاء کرام نے ایران پر اور خاص طور پر ایران کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

میکس ہارٹن میکس ہارٹن MAX HORTON کا خیال ہے کہ منصور،

جنیدؒ اور بایزیدؒ پر ہندو فلسفۂ روحانیت کا اثر ہوا - اس پر پروفیسر آربری لکھتے ہیں کہ جب ہارٹن یہ کہتا ہے کہ منصور ایک برہمن تھا تو ہم اس سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ آیا اس نے منصور کے متعلق میسنو MASSIGNON کی یہ رائے بھی معلوم کر لی تھی کہ منصور کا تصوف قرآن اور حدیث پر مبنی ہے کیونکہ منصور کے متعلق میسنو سے زیادہ کوئی نہیں جانتا - کیا ہارٹن کو ڈاکٹر نکلسن کا یہ قول بھی یاد تھا کہ منصور صحیح معنوں میں موحد (مسلمان) تھا اور یہ کہ نظریۂ ہمہ اوست جو ہندو فلسفہ کی جان ہے منصورؒ کے وقت میں رائج نہیں ہوا تھا - بلکہ اس کے بہت بعد ابنِ عربیؒ نے اس کا چرچا کیا - آگے چل کر آربری لکھتے ہیں کہ ہارٹن کی یہ رائے یقیناً متعصبانہ ہے -

میکڈانلڈ ڈی - بی - میکڈانلڈ D.B. MACDONALD. ایک عیسائی مشنری ہے جو عرصۂ دراز تک مصر میں اپنے مذہب کے لئے تبلیغ کرتا رہا اور صرف ایک مسلمان کو عیسائی بنانے میں کامیاب ہوا - اس کا خیال ہے کہ تصوف فلسفۂ یونان اور عیسائی مذہب سے ماخوذ ہے لیکن اپنی کتاب "اسلام کے مختلف پہلو" ASPECTS OF ISLAM میں یہ تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکا کہ :

"اسلامی تصوف MYSTICISM کی اصل پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات ہیں - میرے نزدیک یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت کی دلیل ہے کہ اسلام نے اس قدر ترقی کی - ہر چیز کی طرح تصوف کے بیج بھی قرآن مجید میں موجود تھے اور قرآن ہی سے تمام علوم و فنون کا آغاز ہوا -" اس عبارت سے اگرچہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک قرآن پیغمبرِ اسلام کا کلام ہے اور یہ غلط فہمی ان کو تورات اور انجیل سے لگی - کیونکہ ان کتابوں میں بھی خدا تعالیٰ کے کلام کے ساتھ پیغمبروں اور ان اصحاب کا کلام مخلوط ہے - بہرحال میکڈانلڈ جیسے متعصب عیسائی مبلغ کا یہی بات تسلیم کرنا کہ تصوف کی اصل قرآن ہے اس بات کی دلیل ہے کہ تصوف کی اصل کے متعلق تمام غیر اسلامی نظریات غلط اور بے بنیاد ہیں -

میکڈانلڈ پر ذکراللہ کا اثر

اسی کتاب میں میکڈانلڈ لکھتا ہے کہ "ایک دفعہ میں مسلمانوں کے حلقۂ ذکر میں شریک ہوا اور میں پُرزور طریق پر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس حلقۂ ذکر میں مجھے ایک سچے مذہب کا احساس ہوا اور وہاں ایک سچا مذہبی جذبہ کارفرما تھا۔ وہاں جتنے آدمی اس ذکر سے روحانی فیض حاصل کر رہے تھے وہ شاید کسی اور جگہ سے حاصل نہ کر سکتے۔"

ایک مسلمان کا عیسائی ہو جانا

ڈاکٹر میکڈانلڈ کی کوششوں سے ایک مسلمان جو صوفی منش تھا عیسائی ہو گیا تھا۔ لیکن میکڈانلڈ لکھتا ہے کہ "وہ آدمی ہمیشہ اپنے کئے پر پچھتاتا رہا کیونکہ وہ کہتا تھا کہ اُسے اسلامی ذکر میں جو مزہ آتا تھا وہ ختم ہو گیا۔ مسلم درویشی کی حالت میں اس کے اندر ایسی روحانیت پیدا ہو چکی تھی کہ جس سے وہ دور کی باتیں معلوم کر لیتا تھا۔ دُور دُور کی آوازیں سُن لیتا تھا لیکن اب وہ سب کچھ کھو چکا تھا۔"

کتاب مذکور میں آگے چل کر میکڈانلڈ لکھتا ہے کہ "قرآن میں ایسی بہت سی عبارات موجود ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک سچے روحانی پیشوا تھے جو وحدانیت کے بے کنار سمندر میں بغیر راہبر اور بغیر کشتی تیر رہے تھے۔ محمدؐ خدا تعالیٰ کے بالکل مست شاعر کی طرح تھے۔ اللہ تعالیٰ کی یاد ہر وقت ان پر غالب تھی۔ اور یہی کیفیات انھوں نے قرآن کی مختلف عبارتوں میں ظاہر کیں۔ محمدؐ کو اپنے منصب کا پُورا یقین تھا اور عجیب بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو فیض INSPIRATION ان کو حاصل ہوتا تھا اس کو وہ صرف اپنے ساتھ یا دوسرے انبیاء تک محدود نہیں کرتے تھے بلکہ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ فیضان اللہ تعالیٰ کے دوسرے دوستوں کو بھی ہوتا ہے (یعنی اولیاء اللہ کو) بلکہ وہ (یعنی محمدؐ) اس حد تک آگے ہیں کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق ہوتا ہے جو خواب کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے۔ اِس وجہ سے محمدؐ نے سچے خواب کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا ہے۔"

میکڈانلڈ لکھتا ہے کہ "قرآن میں ایسی عبارات بکثرت ہیں کہ جن سے اللہ کا بندہ کے ساتھ براہِ راست تعلق ثابت ہوتا ہے جیسے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (اللہ کے ذکر میں اطمینانِ قلب ہے)۔ اسی آیت کی بنا پر بعد کے صوفیا نے حلقہ ہائے ذکر قائم کئے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ذکر کا مطلب ہے یادِ خدا۔" آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ "میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ محمدؐ کے نزدیک ہر شخص جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ سے اطمینانِ قلب، سکون اور قوت حاصل کرتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ اکثر کہا کرتے تھے کہ اے اللہ ہمارے دل تیرے لئے بے چین ہیں اور تجھی سے سکون حاصل کرتے ہیں۔"
اس کے بعد میکڈانلڈ اُن مختلف اثرات کا ذکر کرتے ہیں جو بقول اُن کے مسلمانوں نے دوسرے ذرائع سے قبول کئے اور آخر میں لکھتے ہیں کہ:۔

"آخرکار (امام) غزالیؒ جیسا تعمیری عالم صفحۂ ہستی پر آیا اور اُس نے یہ ثابت کر دیا کہ تصوف اور شریعت ایک چیز ہے۔"

ڈاکٹر نکلسن کے مزید اعترافات

ڈاکٹر نکلسن نے اپنی آخری عمر کی کتابوں میں سے ایک کتاب "تصوف میں نظریۂ شخصیت" (IDEA OF PERSONALITY IN SUFISM) میں لکھا ہے:۔

"اسلام کی باقی تحریکات کی طرح تصوف کی اصل بھی قرآن اور سنت ہے۔ اس کے بغیر تصوف کا تصور مشکل ہے۔ اب میں اس حقیقت کا اقرار کرتا ہوں جس کا اکثر لوگوں نے انکار کیا ہے یا کم از کم جس میں ان کو کچھ شک ہے وہ یہ کہ محمدؐ اپنے مشن میں مخلص تھے اور خدا کے سچے پیغمبر تھے۔ کیونکہ ایک تو اس بات پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے دوسرے یہ حقیقت تسلیم کئے بغیر اسلام کی حقیقت اور ساری اسلامی تاریخ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے ..... قرآن میں بے شمار ایسی باتیں ہیں جو تصوف کی جان ہیں بالفاظ دیگر اگرچہ محمدؐ کا تعلق خدا کے ساتھ دوستانہ نہ تھا تاہم وہاں بھی دوئی مٹ جانے کے بعد

محبوبِ حقیقی کے ساتھ ایک ہوجانے کا ثبوت ملتا ہے ۔"

نکلسن آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :-

"اگرچہ حلاج نے "اناالحق" کا نعرہ لگایا جس کا مطلب یہ ہے کہ "میں حق ہوں۔" لیکن وہ بھی نہایت پرزور الفاظ میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وراء الوریٰ ہے (یعنی کائنات سے علیحدہ ہے) اور خالق اور مخلوق ایک نہیں ہو سکتے۔"

آگے لکھتے ہیں :-

" فنا کا منفی نظریہ بایزید بسطامی سکھاتے تھے۔ لیکن بقا کا مثبت نظریہ ابوسعید الخرّاز نے قائم کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ خودی کا ہمیشہ کے لئے فنا ہو جانا مطلوب نہیں بلکہ اس کا اللہ کے ساتھ باقی رہ جانا اسلام کی غرض و غایت ہے۔ اس کے بعد تمام صوفیاء نے اسی نظریہ پر عمل کیا اور شریعتِ محمّدی پر پابند رہے صوفیاء کا قول ہے کہ بقا آخری مقام ہے جہاں صوفی اللہ کی صفات سے متصف ہو کر دوئی میں واپس آتا ہے اور لوگوں کی ہدایت میں مشغول ہوتا ہے اور اللہ کے فرائض ادا کرتا ہے ..... لیکن تصوّف اسی طرح اسلام کی چیز ہے جیسے مسٹی سزم MYSTICISM عیسائیت کی چیز ہے ۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :-

" صوفی شاعر ابن الفارض کا کلام مقامِ فنا کی پیداوار ہے ......
ابن الفارض نے تین قسم کے مقامات کا ذکر کیا ہے اول عام NORMAL دوم خاص ABNORMAL سوم خاص الخاص SUPER NORMAL - عام حالت کو ابن الفارض "صحو" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ خاص حالت کو "سُکر" (نشہ) اور خاص الخاص حالت

کو "صحو الجمع" یا "صحوِ ثانی" کہتے ہیں۔ پہلی حالت عام آدمی کی ہے دوسری حالت فنا فی اللہ اور تیسری بقا باللہ کی ہے جہاں پہنچ کر آدمی ہدایتِ خلق کی خدمت پر مامور ہوتا ہے..... الفارض کے نزدیک یہ قرآن اور سنّت پر مبنی ہے۔"

آگے چل کر ڈاکٹر نکلسن لکھتے ہیں کہ ابن الفارض متنبہ کرتے ہیں کہ "یہ چیز حلول INCARNATION جیسے کافرانہ نظریہ کے برعکس ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابن الفارض اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور تمام لوگ بھی ان کو مسلمان کہتے ہیں اگرچہ ابن الفارض حالتِ فنا فی اللہ میں یا حقیقتِ محمدیہ جسے "لوگوس" LOGUS کہا جاتا ہے اور جو ذاتِ باری تعالیٰ کا مظہر ہے' میں پہنچ کر وہ مکان وزمان کی قیود سے بلند چلے جاتے ہیں اور بشریت کے تمام تقاضوں سے نکل جاتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اس حالت کو مذہب اسلام کا بلند ترین مقام قرار دیتے ہیں اور وہ خود بتاتے ہیں کہ میں نہ صرف اسلام کے تمام فرائض ادا کرتا ہوں بلکہ نوافل کا بھی پابند ہوں جن سے قرب الی اللہ حاصل ہوتا ہے اور اپنی نظم کے آخر میں وہ مسلمانوں کی طرح دعا بھی مانگتے ہیں"۔

ڈاکٹر نکلسن لکھتے ہیں کہ:

"اس سے ظاہر ہے کہ تصوّف کا اسلامی توحید کے ساتھ کس قدر گہرا اور حقیقی تعلق ہے۔"

منصور ابنِ حلّاج حضرت حسین ابنِ منصور الحلاج کے نعرۂ انا الحق کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نکلسن لکھتے ہیں کہ:-

"حلاج کے انا الحق کا مطلب یہ نہ تھا کہ میں خدا ہوں بلکہ یہ تھا کہ میں حق یعنی سچ CREATIVE TRUTH ہوں۔ یہ نظریہ ہمہ اوست PANTHEISM کے سراسر خلاف ہے کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان خدا کا مظہر ہے۔ یہ نظریہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کے ان کلمات کے تقریباً مطابق ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ "جس نے مجھے دیکھا باپ (خدا) کو دیکھا" لیکن یہ نظریہ جسے حلول INCARNATION کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اسلام میں جڑ نہ پکڑ سکا۔ اسے حلاج اور ان کے مریدین ہی نے ختم کر دیا تھا صوفیا کا بیان ہے کہ حلاج کو اس لئے شہید نہیں کیا گیا کہ وہ "حلولی" تھے بلکہ اس لئے کہ انھوں نے حق تعالیٰ کا راز فاش کر دیا۔"

حلاج اور عیسیٰ علیہ السلام

بعض دفعہ جوش استغراق میں آکر حلاج کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے تھے جن سے ظاہر ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ ؑ کا دوست کہتے تھے اس سے عیسائی مصنفین بہت خوش ہوتے ہیں اور فوراً یہ نظریہ قائم کر لیتے ہیں کہ انھوں نے عیسائیت سے تصوّف حاصل کیا لیکن یہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ حلاج نے تو شیطان اور فرعون کو بھی اپنا دوست کہا ہے کیونکہ حلاج کی طرح عیسیٰ علیہ السلام۔ فرعون اور ابلیس نے جان دے دی لیکن اپنی بات سے نہ ہٹے۔

حضرتِ حلاج کی پابندیٔ شریعت

ڈاکٹر نکلسن کتاب مذکور میں آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"جب حسین بن منصور حلاج کو پھانسی دینے کے لئے لایا گیا تو انھوں نے دار و رسن کو دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ اور اس زور سے ہنسے کہ آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اس کے بعد انھوں نے لوگوں کی طرف دیکھا اور اپنے پیر بھائی اور دوست حضرت ابو بکر شبلیؒ کو دیکھ کر دریافت کیا کہ آپ کے پاس مصلّی ہے؟ انھوں نے جواب دیا جی ہاں یا شیخ! انھوں نے کہا "اسے بچھا دو"۔ اس کے بعد حلاج نے آگے بڑھ کر دو رکعت نماز ادا کی شبلیؒ فرماتے ہیں کہ میں اُن کے پاس کھڑا تھا۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد انھوں نے یہ آیات پڑھیں :۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۔۔۔۔ الیٰ آخر

دوسری رکعت میں بعد فاتحہ آپ نے یہ آیات تلاوت کیں:
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ ۔۔۔۔ الیٰ آخر

نماز کے بعد اُنھوں نے دعا مانگی جس کا مندرجہ ذیل حصہ مجھے یاد ہے :۔
"یا اللہ میری التجا ہے کہ تو نے مجھے اپنے رحم و کرم سے وہ دولتِ دیدار عطا فرمائی جو دوسرے لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے اور جو شکل و صورت سے پاک و منزہ ہے۔ تو نے مجھ پر اپنی ذات و صفات کے وہ اسرار و رموز حلال فرمائے جو دوسروں کی آنکھوں کے لئے حرام ہیں۔ یا اللہ اپنے ان بندوں کو معاف کر جو تیرے دین کی خاطر اور جو تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مجھے قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کیونکہ جو دولت تو نے مجھے عطا فرمائی ہے اگر ان کو عطا فرماتا تو وہ یہ کام نہ کرتے۔ اور اگر تو مجھ سے وہ اسرار چھپا رکھتا جو اُن سے چھپا رکھے ہیں تو میں اس ابتلا میں گرفتار نہ ہوتا۔ سُبْحَانَكَ عَلٰى مَا تَفْعَلُ وَسُبْحَانَكَ عَلٰى مَا تَشَاءُ۔" اس کے بعد وہ خاموش ہو کر مراقب ہو گئے، حتیٰ کہ ابو حارث جلاد نے آگے بڑھ کر آپ کے منہ پر مُکّا مارا اس سے آپ کی ناک ٹوٹ گئی اور خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ یہ دیکھ کر شبلی نے نعرہ مار کر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ آپ کے شاگرد ابوالحسین واسطیؒ اور دوسرے اکابر صوفیا، جو وہاں موجود تھے ان کا بھی یہی حال ہوا اور قریب تھا کہ ملک میں فساد پیدا ہو جائے۔"

ایک اور موقعہ پر آپ کے وہی شاگرد کہتے ہیں کہ میں آپ کے دولت خانہ پر حاضر

ہوا۔ آپ نے مجھے اندر آنے کا حکم دیا۔ میں اندر جا کر آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا۔ اے میرے بیٹے! کچھ لوگ یہ شہادت دیتے ہیں کہ میں ولی اللہ ہوں اور کچھ یہ شہادت دیتے ہیں کہ میں کافر ہوں۔ وہ لوگ جو مجھے کافر کہتے ہیں وہ مجھے اور اللہ تعالےٰ کو ان لوگوں سے زیادہ عزیز ہیں جو مجھے ولی اللہ کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا یا شیخ! اس کی کیا وجہ ہے آپ نے فرمایا جو لوگ مجھے ولی کہتے ہیں وہ مجھے اچھا سمجھ کر یہ بات کہتے ہیں اور جو لوگ مجھے کافر کہتے ہیں وہ اسلام کی محبت کی وجہ سے مجھے کافر کہتے ہیں لہٰذا جو شخص اسلام کی محبت سے مجھے برا کہتا ہے وہ مجھے اور میرے رب کو زیادہ عزیز ہے۔"

ڈاکٹر نکلسن کتاب مذکور میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ شیخ منصور ابن حلاّج خلیفہ منصور کی مسجد میں چلے گئے اور لوگوں کو پکار کر کہا کہ آؤ میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں یہ سن کر بے شمار لوگ آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں سے کچھ آپ سے محبت کرتے تھے اور کچھ آپ سے نفرت کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے میرا خون تم پر حلال کیا ہے پس مجھے قتل کر ڈالو۔ اس پر ایک بزرگ نے جن کا نام عبدالودود بن سعید بن عبدالغنی تھا آگے بڑھ کر کہا یا شیخ! ہم ایسے شخص کو کس طرح قتل کر سکتے ہیں جو نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے۔ حلاّج نے جواب دیا کہ نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور تلاوتِ کلام پاک کرنے کی وجہ سے قتل ممنوع نہیں ہو جاتا۔ مجھے قتل کر دو۔ تاکہ تم کو انعام ملے اور میں آرام کروں۔ اس سے تم غازی بن جاؤ گے اور میں شہید ہوں گا۔"

اس سے ظاہر ہے کہ یہ جو غیر مسلم لوگ الزام لگاتے ہیں کہ صوفیاء نے جب اسلام کو روحانیت سے خالی دیکھا تو دوسرے مذاہب سے اسے حاصل کر کے اسلام سے منحرف ہو گئے سراسر لغو اور بے بنیاد ہے اور تعصب کا نتیجہ ہے۔ یہاں آپ نے خود دیکھ لیا ہے کہ ڈاکٹر نکلسن جیسے محقق جو اوائل عمر میں مواد کی کمی کی وجہ سے تصوف پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے میں پیش تھے اب کس طرح مزید ریسرچ کی بدولت اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں کہ حلاج جیسے انا الحق کا نعرہ لگانے والے غالی صوفی بھی مرتے دم تک نماز روزہ اور تلاوتِ کلام پاک کی

سختی سے پابندی کی اور شریعتِ اسلامی کو قائم رکھا۔ یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جو غلبۂ حال سے مغلوب تھے۔ اسلامی تاریخ میں اس قسم کے مغلوب الحال صوفی بہت ہی کم ہوئے ہیں۔ اس وقت تک معترضین نے صرف دو ایسے صوفیوں کے نام لئے ہیں جو ایک حلاج دوسرے بایزید بسطامیؒ جو مغلوب الحال ہو کر "سبحانی ما اعظم شانی" (میں پاک ہوں اور میری شان بلند ہے) کا نعرہ لگاتے تھے۔ ان کے علاوہ ہزاروں لاکھوں صوفیائے کرام ایسے ہو گزرے جو شریعت کی اس سختی سے پابندی کرتے تھے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ لیکن کس قدر ظلم اور اندھیر ہے کہ صرف ایک دو آدمیوں کو دیکھ کر عیسائی متعصب لوگ نہ صرف لاکھوں صوفیوں کو اسلام کے دائرے سے خارج کر دیتے ہیں بلکہ اسلام کو بھی "بنجر" اور خالی از روحانیت تصور کرتے ہیں اور جن دو آدمیوں کی یہ لوگ مثال دیتے ہیں وہ بھی شریعت کے پابند ہیں۔ ان کا قصور صرف یہی ہے کہ اپنی زندگی میں ایک دو دفعہ انھوں نے ذوق و شوق کی حالت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا دوست اور ہم مسلک کہہ دیا تھا۔ لیکن انھوں نے تو فرعون اور ابلیس کو بھی اپنا ہم مسلک کہا ہے کیونکہ وہ اپنی بات پر جمے رہے۔

امام غزالیؒ بھی صوفیارِ کرام کے اس زمرے میں شامل ہیں جن کو غیر مسلم مصنفین خارج از اسلام قرار دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر نکلسن کی اپنی قلم سے ان کے متعلق سنئے۔ ڈاکٹر نکلسن کتاب مذکور میں لکھتے ہیں :۔

"مسلمان لوگ کہتے ہیں کہ اگر آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی ہوتا تو امام غزالیؒ ہوتے۔ اگرچہ امام غزالی کا تعلق تصوف کی نسبت اسلام سے زیادہ ہے لیکن پھر بھی انھوں نے صوفی بننے کے بعد عرفان حاصل کیا اور بڑی بڑی کتابیں لکھیں۔"

آگے چل کر ڈاکٹر نکلسن لکھتے ہیں کہ امام غزالی نے صوفیار کی تعریف یوں کی ہے :۔

"صوفیار کے ظاہری اعمال اور باطنی احوال (جمع۔ حال۔ کیفیت) اور ان کی تمام روشنیوں کا سرچشمہ آفتابِ نبوت ہے۔ نبوت کے سوا کوئی ذریعۂ

روشنی نہیں۔ جو شخص باطنی انوار سے بے بہرہ ہے بنوت کو اس نے سمجھا ہی نہیں۔ صوفیار کرام کے تمام انکشافات اور کرامات اتباع نبوت کا صلہ ہیں..... اپنی آخری کتاب "مشکوٰۃ الانوار" میں امام غزالی ایک ایسی شخصیت کا تعارف کراتے ہیں جسے وہ "مُطاع" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ "مطاع" بمعنی اطاعت کیا گیا۔ مُطاع پوری کائنات میں خلیفہ یا نائب ہے جو اللہ کی طرف سے کائنات پر حکمرانی کرتا ہے۔ مطاع سے مراد وہی "لوگوس" ہے جو صوفیار کے نزدیک حقیقتِ محمّدی ہے (یاد رہے کہ نیو پلیٹو نزم NEO-PLATONISM. میں بھی "لوگوس" یعنی حقیقتِ محمّدی کا اعتراف کیا گیا ہے) اس حقیقت کو قرآن میں "امر" کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ 'روح سے مراد یہاں روحِ محمّدی یا حقیقتِ محمّدی ہے جو 'مطاع' ہے اور جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا حکم دنیا میں چلتا ہے۔"

آگے چل کر ڈاکٹر نکلسن لکھتے ہیں :-

"یہ امر مسلمہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت کے تمام صوفیار معترف ہیں یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جنہوں نے الوہیت کے نعرے لگائے ——— بایزید بسطامیؒ (جنہوں نے سبحانی ما اعظم شانی کہا) کا قول ہے کہ جو کچھ تمام انبیاء (علیہم السلام) کو ملا ہے وہ شہد کی ایک مشک کی طرح ہے۔ اس مشک سے جو قطرہ گرتا ہے ہر ولی کا وہ حصہ ہے لیکن پوری مشک میں جو کچھ ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ ہے..... ابو سعید خرّاز کہتے ہیں کہ انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے.... جب اس کے ساتھ حقیقت محمدیہ کا نظریہ شامل ہوا یعنی جب محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کائنات میں خلیفۃ اللہ مانا گیا تو اللہ اور محمدؐ کا ایک ہونا شریعت میں جائز ہو گیا اور یہی وہ نظریہ

مطاع ہے۔ جو امام غزالی رح نے پیش کیا۔ بہر حال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہستی تمام صوفیا کے نزدیک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔"

ڈاکٹر نکلسن کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ تصوف اور اسلام ایک چیز ہے تصوف عین اسلام ہے اور اسلام عین تصوف ہے۔

ڈاکٹر نکلسن جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی (JOURNAL OF ROYAL ASIATIC SOCIETY) سال ۱۹۰۶ء میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ تصوف پر عیسائی اثر ہوا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ زہد و تقویٰ پر مبنی تصوف جس طرح کہ ہم ابراہیم بن ادھم، داؤد طائی، شفیق بلخی اور فضیل بن عیاض میں دیکھتے ہیں نہ عیسائیت کا مرہونِ منت ہے نہ کسی اور اثر کا بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا تصوف اسلام کی پیداوار ہے اور اسلامی نظریۂ توحید کا نتیجہ ہے۔"

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ تصوف کی اصل کے متعلق مختلف نظریات گشت کر رہے ہیں لیکن آج تک کسی اعتراض کرنے والے نے تاریخی اور وقتی عناصر (HISTORICAL AND CHRONOLOGICAL FACTORS) پر غور نہیں کیا۔ ان عناصر کو نظر انداز کر کے محض قیاس آرائی سے کام لینا ہمارے خیال سے بے اصولی بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تصوف کے اصول ویدانت سے ملتے جلتے ہیں لیکن یہ بات کہ آیا تصوف ویدانت سے ماخوذ ہے تاریخی شواہد سے طے ہونی چاہیئے مثلاً یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کس زمانے میں ویدانت کا مسلمانوں پر اثر ہوا کیا یہ وہی وقت تھا جب تصوف کی ابتدا ہوئی۔ نیز یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ ویدانت اور تصوف میں کونسی باتیں یکساں ہیں۔ اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے

کہ تصوف پر ایرانی اثر ہوا اس وجہ سے کہ تصوف کے موجد معروف کرخی تھے جو ایران کے رہنے والے تھے تو اس سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا یہ بات تاریخی لحاظ سے ممکن بھی ہے۔ دراصل معروف کرخی تصوف کے موجد نہیں بلکہ تصوف کے مرتب کرنے والے ان کے خلفا رابو سلمان دارانی اور ذوالنون مصری ہیں جن کی رگوں میں ایرانی خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے اسی طرح تصوف اور نیو پلیٹونزم NEO-PLATONISM. کے درمیان جو مشابہت ہے۔ اس کے متعلق بھی مندرجہ بالا کسوٹی استعمال کرنی چاہیئے۔ محض مشابہت کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تصوف اس کا مرہونِ منت ہے۔"

تصوف اور عیسائیت میں مشابہت کے وجوہات

پروفیسر آربری لکھتے ہیں کہ پلیسیوس نے اپنی ایک کتاب میں انجیل مقدس کے چند واقعات بیان کئے ہیں جو قرآن میں بھی پائے جاتے ہیں اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام نے عیسائی مذہب سے استفادہ کیا لیکن پلیسیوس کی یہ دلیل غلط ہے کیونکہ قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ جو کچھ محمدؐ پر نازل ہوا ہے وہ تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔ نیز چونکہ دونوں مذاہب کی اخلاقی اور روحانی تعلیمات یکساں ہیں اور چونکہ اللہ کی حقیقت بھی ایک ہے اس لئے مختلف مذاہب میں مشابہت کا ہونا لازمی ہے لیکن افسوس ہے کہ کوئی غیر مسلم مصنف ایسا نہیں آیا جس نے اسلام کی ہر اچھی چیز کو دوسرے مذاہب سے منسوب نہ کیا ہو۔ یہ صحافی بددیانتی، حد درجہ کی تنگ نظری اور تعصب ہے۔"

اس کے بعد پروفیسر آربری پلیسیوس کے تمام الزامات کی فرداً فرداً تردید کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

"ریسرچ کی حالیہ سٹیج STAGE پر ہم اس قابل نہیں ہوئے کہ

تصوّف اور خاص طور پر ابن عربی کے متعلق کوئی فیصلہ کرسکیں۔ ابن عربی ایک بہت بلند پہاڑ کی چوٹی کی طرح ہیں جسے آج تک کسی نے سر نہیں کیا اس پہاڑ کے گرد تمام علاقہ ہمارے لئے صیغۂ راز بنا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس راستہ سے اوپر جائیں ..... یہ وقت فیصلہ کرنے کا نہیں ہے ابھی ہم نے بہت کام کرنا ہے۔ یہ کام مشکل اور صبر آزما ہے۔ ہم نے مسینو کی طرح اسلام کے ہر بزرگ کے متعلق تحقیق سے کام لینا ہے۔ نیز نکلسن کی طرح ہم نے ان کی کتابوں پر غور و خوض کر کے ان کے معانی سمجھنے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے مختلف مذاہب مثلِ عیسائیت، ہندو دھرم بدھ مت۔ ایران و مصر کے مذاہب کے روحانی نظریات کا جائزہ لینا ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ ان کی حقیقت کیا ہے اور پھر یہ دیکھنا ہے کہ آیا ان کو تصوف سے کوئی حقیقی نسبت ہے یا نہیں۔ یہ بھی دیکھنا ہے کہ آیا اسلام اور دیگر مذاہب کے درمیان کوئی تاریخی ملاپ رہا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد یہ دیکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ تصوف کا دوسرے مذاہب پر کیا اثر ہوا۔ اس سلسلہ میں پلیسیوس کی کتاب "اسلام اور ڈیوائن کامیڈی" ہمارے لئے ایک عمدہ مثال ہے۔"

آگے چل کر پروفیسر آربری لکھتے ہیں کہ :۔

"صرف یہی نہیں بلکہ ہمیں تمام اسلامی زبانوں مثل عربی۔ فارسی، ترکی، اُردو، پنجابی، پشتو میں مہارت حاصل کرنے کے علاوہ ہمیں یونانی، عبرانی قدیم مصری، سنسکرت اور دوسری زبانوں میں بھی مہارت حاصل کرنی ہو گی اس کے ساتھ ساتھ ہمیں انگریزی، فرانسیسی، اطالوی اور ہسپانوی اور روسی زبانوں میں بھی مہارت حاصل کرنی ہو گی۔ زبان دانی کے علاوہ ہمیں قرآن، حدیث اور فقہ کے مختلف مکاتیب فکر SCHOOLS OF

THOUGHT کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان تمام شرائط کو پورا کئے بغیر ہمارے لئے تصوف کی اصل پر فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ تصوف کو سمجھنے کے لئے ہمیں علم روحانیت کا کچھ نہ کچھ علم اور روحانیت کی طرف کچھ قدرتی میلان ضروری ہے۔ اس کام میں صرف شوق کافی نہیں بلکہ مناسبتِ طبع کی بھی ضرورت ہے۔ چونکہ علم روحانیت تمام علوم و فنون کا نصب العین اور منزلِ مقصود ہے اس لئے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ عرفائے اسلام کی کہاں تک رسائی ہوئی ہے تاکہ ہم بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ آخر میں ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ یہ کام محبت اور ہمدردی سے ہو سکتا ہے مخالفت اور دشمنی یا تعصب سے نہیں ہوتا۔۔۔۔ مختصر یہ کہ صوفیا کو سمجھنے کے لئے خود صوفی ہونا ضروری ہے۔ اس وقت تصوف کی اصل کے متعلق جتنے نظریات THEORIES موجود ہیں سب ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔"

اس کے بعد آربری لکھتے ہیں کہ :

"جن مذاہب کی روحانی تعلیمات کا تصوف پر اثر انداز ہونا بتایا جاتا ہے ان کی پوری تحقیق کی بھی ضرورت ہے۔ مثلاً صرف پلاٹائنس PLOTINUS کی تحریر اینیڈس ENNEADS کے متفرق اور سیاق و سباق سے کٹے ہوئے اقتباسات نقل کرنا کافی نہیں ہے۔ ہمیں تو اب تک یہ بھی معلوم نہیں کہ پلاٹائنس کی کسی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا تھا یا نہیں۔ یا جس مسلم صوفی پر یونانی فلسفہ کا اثر ہوا وہ یونانی زبان سے واقف تھا یا نہ تھا۔۔۔۔۔۔

اسی طرح بعض نظریات یہ بھی ہیں کہ ہندو مذہب کا یونان پر اثر ہوا نیز یونان کا عیسائی مذہب پر اثر ہوا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ جب خدا ایک ہے حقیقت ایک ہے اور ساری مخلوقات کے

لئے مختلف اوقات میں ایک ہی قسم کی تعلیمات نازل ہوئیں تو مشابہت کا پایا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور ضروری بات ہے وہ یہ کہ ہندوستان میں جو تصوف رائج ہے اس کا مطالعہ کرنا چاہئے ہندوستان میں بڑے بڑے صوفیار کرام ہو گزرے ہیں مثل خواجہ فریدالدین گنج شکر، نظام الدین اولیا، نصیرالدین چراغ دہلوی، شرف الدین یحییٰ منیری، محمدؐ گیسودراز، ان کے نظریاتِ تصوف کو دیکھنا چاہئے کہ کہاں تک ہندو فلسفہ سے متاثر ہوئے ہیں۔ نیز ہم نے ہندوستان کے موجودہ صوفیار کا بھی بغور مطالعہ کرنا ہے۔ ہندوستان ایسا محاذ ہے کہ اب تک اس پر بہت کم سُنا گیا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ میدان دوسروں کی نسبت بے حد وسیع اور بے حد زرخیز ہے۔"

آگے چل کر پروفیسر آربری ایک نہایت ہی اہم اور دلچسپ بات کہتے ہیں :-

"تصوفِ اسلام کے متعلق ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ کوئی علیٰحدہ اور دور افتادہ چیز نہیں ہے بلکہ پوری ہی نوع انسان کا سرمایہ ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے ہمارے تمام مذہبی تعصبات اور اختلافات بھی ختم ہو سکتے ہیں اور دُنیا کے تمام لوگوں کے لئے یہ مشترکہ چشمۂ ہدایت بن سکتا ہے عام لوگ یہ معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں کہ مقربانِ حق نے کیا کہا ہے۔ اگر اُن کے اقوال اور مشاہدات مناسب شکل میں دُنیا کے سامنے پیش کئے جاویں تو اس سے لوگ راہِ ہدایت اور سکون حاصل کر سکتے ہیں اور موجودہ مادی دور کی پریشانیوں سے بچ سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ عام لوگ تصوف سے سکون حاصل کر سکتے ہیں لیکن ہر ملک میں خواص بھی رہتے ہیں۔ مثلاً وہ عیسائی۔ یہودی، ہندو وغیرہ جو روحانیت کا شوق رکھتے ہیں وہ لوگ اسلامی تصوف سے خاص طور پر

فائدہ حاصل کرسکتے ہیں کیونکہ وہ علم روحانیت کی اصطلاحات سے بھی واقف ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے رسالۂ قشیریہ، کلاباذی کی کتاب "تعرّف فی مذہب التصوف" کے تراجم ضروری ہیں۔ علاوہ ازیں خواص والخواص بھی ہیں جو حقیقت کی تلاش میں تڑپ رہے ہیں ان کے لئے تصوف بے حد مفید ہوگا۔" آربری کا بیان ختم ہوا۔

مختلف روحانی نظریات کا موازنہ

پروفیسر آربری نے اوپر کے بیان میں نہایت حق و انصاف سے کام لیا ہے۔ اگرچہ جو کام اس نے تجویز کیا ہے بے حد مشکل اور طویل ہے۔ ہم یہاں مختصر طور پر اسلامی تصوف کا دوسرے مذاہب کے روحانی نظریات سے موازنہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ قارئین خود دیکھ لیں کہ حقیقت کیا ہے۔

تصوف اور نظریۂ یونان

یہ جو الزام لگایا جاتا ہے کہ تصوف پر فلسفۂ یونان کا اثر ہوا ہے اس کے متعلق چند اہم امور پیش کئے جاتے ہیں پہلی بات یہ ہے کہ تاریخ اسلام میں فلاسفۂ اسلام اور صوفیاء اسلام دو الگ گروہ ہیں فلاسفہ میں ابن سینا، ابونصر فارابی، ابن رشد وغیرہ شامل ہیں۔ صوفیاء کا گروہ امام غزالی، جنید بغدادی، ذوالنون مصری، بایزید بسطامی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ لندن اور پیرس میں بیٹھ کر عیسائی مصنف جو چاہیں لکھ سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے یہ فلاسفر ساری اسلامی دنیا میں کافر اور بے دین خیال کئے جاتے ہیں۔ اسلامی دنیا کا بچہ بچہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ مسلم فلاسفروں سے نہ صرف صوفیاء کرام بلکہ مسلم علماء بھی ہمیشہ برسر پیکار رہے ہیں۔ ابن سینا، فارابی اور ابن رشد کے نظریات ضرور کسی حد تک یونانی فلاسفہ کے مطابق ہیں لیکن جہاں تک صوفیاء کرام کا تعلق ہے انھوں نے ہمیشہ ان کی مخالفت کی ہے۔ یہ بات بھی مسلّم ہے کہ جن صوفیائے کرام نے یونانی فلسفہ کے متعلق کچھ کہا ہے وہ تصدیق نہیں بلکہ تردید میں کہا ہے مثلاً امام غزالیؒ

نے اپنی کتاب "تحافۃ الفلاسفہ" میں فلاسفۂ یونان اور مسلم فلاسفہ کی پرزور تردید کی ہے علاوہ ازیں انھوں نے فلاسفۂ یونان کی غلطیاں بھی درست کی ہیں۔ ابنِ رشد نے جو اندلس کے بہت بڑے مسلم فلسفی تھے اپنی کتاب "تحافۃ التحافہ" میں امام غزالی کی کتاب "تحافۃ الفلاسفہ" کی تردید کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ صوفیاء کرام اور مسلم فلاسفہ کے مابین بے حد اختلاف تھا لیکن یورپ کے سطح بین مصنف اس عظیم اختلاف سے یا تو بے خبر ہیں یا جان بوجھ کر اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ البتہ پروفیسر آربری نے صوفیاء کرام اور مسلم فلاسفہ کے اختلاف سے باخبر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ امام غزالی رح کی کتاب "تحافۃ الفلاسفہ" کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ امام غزالی نے یہ کتاب لکھ کر تمام فلاسفروں کے لئے جلّادِ اعظم EXECUTIONER-IN-CHIEF کا کام کیا ہے۔ یعنی ان کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا ہے۔

تصوف اور نیو پلیٹونزم NEOPLATONISM

اس میں شک نہیں کہ پلاٹائنس PLOTINUS فلاسفر سے زیادہ صوفی اور روحانی آدمی تھے لیکن اسلامی نظریۂ تصوف اور پلاٹائنس کے نظریۂ روحانیت میں بہت فرق ہے۔ اس کتاب میں پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ اسلام میں فنا فی اللہ آخری مقام نہیں ہے بلکہ بقا باللہ اور عبدیت آخری مقام ہے۔ ڈاکٹر نکلسن دیوان شمس تبریز کے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:-

"پلاٹائنس کے نزدیک روحِ انسانی کے لئے واپس خدا کی طرف جانا انسان کا آخری مقام ہے (RETURN SUMS UP THE WHOLE DUTY OF MAN) علاوہ ازیں صوفیا کے نزدیک صرف ذاتِ حق قدیم ہے باقی ہر چیز حادث یعنی فانی ہے لیکن فلاسفۂ یونان کے نزدیک خدا کے ساتھ مادہ اور روح بھی قدیم ہے۔ افلاطون کے اُستاد حکیم سقراط کو اسی لئے تو زہر دے کر حکومت وقت

نے نقل کیا تھا کہ وہ روح کو قدیم IMMORTAL بتاتا تھا۔

تصوف اور ہندو ویدانت اسی طرح سب مسلمان جانتے ہیں معلوم نہیں یورپ کے محققین اس بات سے کیوں بیگانہ ہیں کہ ہندو دھرم میں خدا روح اور مادہ قدیم مانے جاتے ہیں لیکن صوفیا کرام اس نظریے کو حرام اور کُفر قرار دیتے ہیں۔ نیز ہندو فلسفۂ روحانیت میں بھی یونان کی طرح فنا آخری مقام ہے، لیکن صوفیاء کرام کے ہاں آخری مقام بقا باللہ اور عبدیت ہے۔ نیز ہندو دھرم میں تناسخ ہے لیکن صوفیا تناسخ کے سخت خلاف ہیں ہندو دھرم میں بُت پرستی ہے۔ لیکن صوفیا بُت پرستی کو حرام کہتے ہیں۔ ہندو دھرم میں حلول جائز ہے۔ صوفی حضرات حلول کو ناجائز سمجھتے ہیں۔

تصوف اور بُدھ مت بدھ مت میں بھی فنا آخری مقام ہے بلکہ بعض یورپین محققین کا گوتم بدھ کے متعلق تو یہ نظریہ ہے کہ وہ مذہبی آدمی ہی نہیں تھے۔ بدھ کا مدعا اور مقصد سکونِ قلب (شانتی) تھا جو انھوں نے گوشہ نشینی میں حاصل کیا اور بس۔ خدا کے ساتھ اُسے کوئی تعلق نہ تھا مسز الیگزنڈریا ALEXEND-ERATA — جس نے تبت میں رہ کر بدھ مت کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے اپنی ایک کتاب میں لکھتی ہے کہ بعض بدھ روحانی آدمیوں کے ساتھ تبادلۂ خیال سے یہ معلوم ہوا کہ وہ اسلامی اوراد و وظائف کی مدد سے مافوق العادات کام کر سکتے ہیں۔ مثلاً تھوڑی دور تک اُڑ سکتے ہیں اور کئی کئی دن بغیر کھائے پیے رہ سکتے ہیں اور ہمیشہ لوگوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں اس کے برعکس صوفیاء کرام کو خلافت دے کر اس بات پر مامور کیا جاتا ہے کہ گوشہ نشینی ترک کریں اور مخلوقات کی ہدایت میں مصروف ہو جائیں شادی بیاہ کریں، بال بچوں کے حقوق ادا کریں، ہمسایوں کے حقوق ادا کریں۔ جہاد کریں اور سیاسی اقتصادی اور سماجی زندگی میں حصہ لے کر خدمتِ خلق انجام دیں۔ یہ ہے فرق فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا۔ فنا میں آدمی ہمیشہ کے لئے کھو جاتا ہے اور اسلامی نظریۂ بقا باللہ میں وہ فنا کی محویت و استغراق سے نکل کر بقا باللہ پر پہنچتا ہے اور صحو بعد سکر (بے خودی کے بعد ہوشیاری) میں آکر مسندِ خلافت پر

متمکن ہوتا ہے اور زندگی کے فرائض بھی ادا کرتا ہے اور ہدایتِ خلق پر بھی مامور کیا جاتا ہے یہ ہے اسلام کا وہ کمال جس کی طرف آیۂ مبارک اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (آج میں نے تمہارے لئے دین مکمل کیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کی ہے) کا اشارہ ہے۔

تصوّف اور عیسائی نظریۂ روحانیت

یورپ کے بعض محققین کا نظریہ یہ ہے کہ عیسائی نظریۂ روحانیت یونان سے لیا گیا ہے اور یونانی فلسفہ ہندو فلسفہ سے ماخوذ ہے۔ لہٰذا عیسائیت اور ہندو دھرم کا تعلق پوتا اور دادا کا ہونا چاہئے لیکن بظاہر ہندو فلسفۂ روحانیت اور عیسائیت میں کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ انڈرہل UNDERHIL کی تحقیق یہ ہے کہ عیسائی روحانیت نیو پلیٹو نزم NEOPLATONISM. سے ماخوذ ہے۔ عیسائی روحانیت میں بھی بدھ مت اور نیو پلیٹو نزم کی طرح فنا آخری مقام ہے۔ لیکن اسلامی تصوّف کی آخری منزل بقا باللہ ہے لہٰذا یہ کہنا کہ تصوّف عیسائی نظریۂ روحانیت سے ماخوذ ہے حد درجہ کی جہالت ہے۔ دونوں کے درمیان مشابہت ضرور ہے لیکن مشابہت کے وجوہات آپ پہلے سُن چکے ہیں جب خدا ایک حقیقت ہے، انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں یگانگت کا پایا جانا غیر معمولی بات نہیں ہے۔ مشابہت کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ اور جسے اہلِ مغرب کے بعض منصف مزاج مصنفین بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ عیسائی رُوحانی اکابر خود اسلامی تصوّف سے متاثر ہوئے ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے یہ بات وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی کہ جب پورے براعظم یورپ پر مسلم سپین کا زبردست اثر ہو۔ یورپین مورخ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اہلِ یورپ نے تمام علوم و فنون سپین کی مسلم یونیورسٹیوں سے سیکھے اور جب یورپ کے لوگ اسلامی تہذیب و تمدّن سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مسلمانوں کی طرح اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، پہننے اور زندگی بسر کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے تو کیا صرف تصوّف کے میدان میں گنگا نے اُلٹی جانب بہنا شروع کر دیا تھا۔ اسی لئے تو آربری لکھتے ہیں کہ پلیسیوس

نے اپنی کتاب "اسلام اور ڈیوائن کامیڈی" لکھ کر اُلٹی گنگا بہادی ہے۔

غلط فہمی کی وجہ

ان تمام غلط فہمیوں کی وجہ یہ ہے کہ مغربی محققین نے نہ موجود صوفیا کرام کو مل کر ان سے حقیقت حال دریافت کی ہے نہ ان کی کتابوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ آربری لکھتے ہیں کہ مشہور صوفی کلاآبادی کی کتاب تعرف الیسی کتاب ہے کہ جس میں مصنف نے خود اپنے آپ کو مسلمان قرار دیا ہے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ صوفی لوگ اسلام سے منحرف نہیں ہوئے تھے بلکہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے۔ کیا آربری اور اس کے دوست یہ نہیں جانتے کہ صوفیاء کرام کی کتابوں میں یہی دعویٰ کیا گیا ہے اور ہر صوفی نے اپنے آپ کو اسلام کا ادنیٰ خادم اور رسول اللہ علیہ وسلم کا ادنیٰ غلام کہا ہے۔

ابن حلاجؒ اور پابندیٔ شریعت

خود منصور حلاج جنہوں نے بظاہر غیر شرعی نعرۂ انا الحق لگایا اور جس سے ان کو اہل مغرب نے میثاقی قرار دے دیا ہے وہ بھی قید خانہ میں ہر رات کئی سو رکعت نفل ادا کرتے تھے۔ قتل کے فوراً پیشتر بھی انھوں نے شبلیؒ سے مصلّی لے کر دو رکعت نماز ادا کی

بایزید بسطامیؒ اور شریعت

بایزید بسطامیؒ جنہوں نے دوسرا غیرہ شرع نعرہ (سبحانی ما اعظم شانی) لگایا ان کی پابندیٔ شریعت کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر خربوزہ نہ کھایا اس خیال سے کہ معلوم نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خربوزہ کس طرح کھاتے تھے۔ نیز فرماتے ہیں کہ اگر تم دیکھو کہ کوئی شخص ہوا میں اڑتا ہوا آرہا ہے تب بھی دھوکہ نہ کھانا جب تک کہ یہ دیکھ لو کہ امر و نہی اور حدودِ شریعت میں وہ کس طرح ہے۔

حضرت جُنیدؒ بغدادی اور شریعت کی پابندی

حضرت جنیدؒ بغدادی پر بھی اہلِ مغرب یہ الزام لگاتے ہیں کہ اسلام سے منحرف ہو گئے تھے۔ لیکن حضرت جنید خود فرماتے ہیں کہ تمام مخلوق پر ساری راہیں بند ہیں بجز اس شخص کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بہ قدم چلے۔ نیز فرمایا کہ ہمارا یہ علم (تصوف)

کتاب وسنت (قرآن وحدیث) سے لیا گیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ ہوا میں چار زانو بیٹھا ہوا ہے تو تم اس کی طرف التفات نہ کرو جب تک کہ تم اُس کو کتاب و سنّت (قرآن وحدیث) کا پابند نہ دیکھ لو۔

نیز حضرت جنید فرماتے ہیں کہ میں حاکم ہوتا تو ایسے شخص کی گردن مار دیتا جو یوں کہتا لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ (اللہ کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں) یا لَا فَاعِلَ اِلَّا اللّٰہ (اللہ کے سوا کوئی فاعل نہیں) نیز آپ فرماتے ہیں" جو شخص یہ کہے کہ اب میں واصل باللہ ہو گیا اس لئے شریعت کی پابندی لازم نہیں تو وہ شخص یہ تو سچ کہتا ہے واصل ہو گیا مگر واصل جہنم ہے۔ جو شخص چوری اور زنا کرتا ہے وہ ایسے شخص سے اچھا ہے اگر میں ہزار سال تک زندہ رہوں تو شرعی عذر کے بغیر اپنے اوراد میں ذرّہ برابر کمی نہ کروں۔ احکام شریعت تو بڑی چیز ہیں"۔

حضرت شیخ محی الدین ابن عربی سب سے زیادہ اعتراض شیخ محی الدین ابن عربی پر ہوئے ہیں کیونکہ انھوں نے جب مسئلہ وحدت الوجود کو ظاہر کیا تو علمائے ظواہر سخت مخالف ہو گئے۔ اہلِ مغرب بھی ابن عربی کو سمجھنے سے قاصر رہے کیونکہ ان کا مسئلہ وحدت الوجود ایسی چیز ہے جس سے دوسرے مذاہب مثل عیسائیت اور فلسفۂ یونان اور ویدانت کا گمان ہوتا ہے۔ اب آئیے ہم دیکھتے ہیں کہ ابن عربی خود اپنے مسلک کے متعلق کیا کہتے ہیں۔

(۱) "فتوحاتِ مکیہ" میں آپ لکھتے ہیں کہ جو حقیقت خلافِ شریعت ہے وہ زندقۂ باطلہ (باطل کفر) ہے۔ (۲) نیز فتوحات مکیہ" میں لکھتے ہیں کہ ہمارے لئے اللہ تعالےٰ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں بجز شریعت کے (۳) نیز فتوحات میں فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ کہے کہ شریعت کے بغیر اللہ تعالےٰ تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ ہے تو وہ جھوٹا ہے پس ایسے شخص کی اقتدا نہ کرنا چاہیئے (۴) نیز آپ فرماتے ہیں کہ جو شخص میزانِ شریعت کو ایک لمحہ کے لئے بھی ہاتھ سے پھینک دے گا ہلاک ہو جائے گا۔ (۵) نیز فتوحاتِ مکیہ کے تین سو باسی

باب میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عوامض شریعت اور مشکلاتِ علم توحید کو حل کرنے کی طرف آنا چاہے تو اُس کو چاہئے کہ اپنی عقل اور رائے کو چھوڑ کر شرعِ ربّانی کو اپنا پیشوا بنائے (۶) نیز فرمایا کہ جاننا چاہئے کہ تقدیم کشف کی نص پر ہمارے نزدیک محض باطل ہے۔ (یعنی کشف کو احکامِ شریعت پر مقدم سمجھنا باطل ہے) کیونکہ اہلِ کشف کو اکثر اشتباہ ہوتا ہے ورنہ کشفِ صحیح ہمیشہ شریعت کے مطابق ہوتا ہے۔ جو شخص کشف کو شریعت پر مقدم کرے وہ اہل اللہ کی جماعت سے خارج ہو جائے گا۔ (۷) نیز فتوحات کے باب ایک سو پچاسی میں فرمایا ہے کہ میزانِ شرع کی جو دنیا میں موجود ہے وہی شریعت ہے جو علماء کے ہاتھ میں ہے پس جب کوئی ولی شرع کی میزان مذکور سے خارج ہو گا اس پر اعتراض واجب ہو گا۔ پھر اگر اس پر حال غالب ہے تو ہم اس پر اعتراض نہ کریں گے۔ (۸) فتوحات کے باب دو سو چھیالیس میں فرماتے ہیں کہ علم ظاہری میں میزانِ شرع کو ہرگز اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ (۹) نیز فرمایا کہ جب کسی صاحبِ کشف پر ایسا کشف وارد ہو جو شریعت کے خلاف ہے تو اس کو ترک کر دینا لازم ہے۔ کیونکہ یہ بات تمام اہلِ کشف کے نزدیک ثابت ہے کہ نبوت ختم ہو جانے کے بعد حلال و حرام کا حق کسی کو نہیں ہے۔ لہٰذا خوب ہوشیاری سے کام لو اور کشف کی خرابیوں سے اپنی حفاظت کرو۔ پس میں تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر چکا۔ (۱۰) نیز فرمایا کہ علم شریعت کو لازم پکڑو کیونکہ شریعت ہی تمہاری وہ کشتی ہے کہ اس میں رخنہ پڑ جائے تو تم سب ہلاک ہو جاؤ گے اور تم سے اپنی رعیت میں حدودِ الٰہیہ قائم کرنے کے متعلق باز پرس ہو گی۔

اس سے ظاہر ہے حضرت ابنِ عربی جیسے وحدتِ وجود کے قائل بھی شریعت کی پابندی میں کس قدر سخت تھے۔ حالانکہ کم فہم لوگوں نے آپ پر کفر کے فتوے بھی لگائے اور بے دین کہا۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ ان کا کلام لوگ اچھی طرح نہ سمجھ سکے۔

صوفیائے ہندوستان پروفیسر آربری نے یہ بات بہت اچھی کہی ہے کہ ہندوستان کے صوفیاء کو دیکھنا چاہئے کہ اُن پر ہندو فلسفۂ روحانیت کا اثر ہوا

ہے یا نہیں۔ سب سے پہلے صوفی جو ہندوستان میں آئے حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش لاہوری ہیں۔ ان کی کتاب "کشف المحجوب" دنیا کے سامنے ہے خود ڈاکٹر نکلسن نے بھی اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ آپ متبع شریعت تھے اور ہندو فلسفۂ ویدانت کی بو تک اس کتاب سے نہیں آتی۔ حلول ہندو دھرم کا سب سے بڑا عقیدہ ہے۔ ہندو لوگ رام چندر اور کرشن جی مہاراج کو خدا کا اوتار مانتے ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ رام چندر اور کرشن میں اُتر آئے ہیں لیکن حضرت داتا گنج بخش علیہ رحمۃ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں حلول کو حرام قرار دیا ہے اور حلولیوں پر لعنت کرتے ہیں۔ کتاب مذکور کی شان یہ ہے کہ آپ نے تصوّف کے تمام مضامین علیٰحدہ علیٰحدہ ابواب میں بیان کیا ہے اور ہر مضمون کے ثبوت میں پہلے قرآن مجید کی آیات پیش کرتے ہیں۔ ہر معاملہ میں آپ شریعت کو مقدم رکھتے ہیں اور تصوّف کی ہر چیز اور ہر بات کو قرآن و حدیث سے ثابت کرتے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رح آپ نے ساری عمر ہندوستان میں گذاری۔ لیکن آپ کی تعلیمات سوانح حیات اور ملفوظات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہمیشہ ہندو جوگیوں کا مقابلہ کیا اور ان کو مسلمان بنا کر چھوڑا۔ بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت خواجۂ بزرگ رح نے ہندوستان میں آکر ہندوؤں کی خاطر سماع شروع کیا لیکن یہ ان کی کم عقلی اور کم علمی کی دلیل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپکے شیخ حضرت خواجہ عثمان ہارونی قدس سرہٗ جو اکثر ایران، عراق اور حجاز مقدس میں رہتے تھے سماع کے شائق تھے۔ یہاں تک جن علماءٗ نے حکومتِ وقت کے ایمار پر آپ سے سماع کے بارے میں مناظرہ کیا تو آپ کی کرامت کی وجہ سے اُن علمار کا علم مسلوب ہو گیا حتیٰ کہ الف ب تک بھول گئے اور جب اس حرکت سے توبہ کی تو ان کا علم واپس لوٹ آیا۔ راجہ پرتھوی راج جو سارے ہندوستان کا بادشاہ تھا اور جس کا پایۂ تخت اجمیر تھا ہمیشہ ہندو ارباب روحانیت کو خواجۂ بزرگ رح

کامقابلہ کرنے کے لئے بھیجتا رہا۔لیکن جو شخص آپ کی خدمت میں آیا مسلمان ہوگیا اسی طرح آپ نے ہزاروں نہیں لاکھوں ہندوں کو مسلمان کیا جن کی اولاد اور پھران کی اولاد کی تعداد اب کروڑوں تک پہنچ گئی۔ آپ کے جانشینوں نے بھی تبلیغ اسلام کا مشن جاری رکھا چنانچہ آپ کے خلیفہ کے خلیفہ حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر قدس سرہٗ نے سرزمینِ پنجاب کی بے شمار ہندو، راجپوت، جاٹ قوموں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ان اقوام میں بڑی بڑی قومیں یہ ہیں: سیال - ٹوانہ - دٹو - بھٹی - اعوان - کھوکھر لنگاہ - ارائیں وغیرہ وغیرہ - اگر بقول شخصے صوفیائے ہند ہندو دھرم کے خوشہ چیں اور مرہونِ منت ہوتے تو وہ لوگوں کو ہندو بناتے نہ کہ مسلمان۔ معترضین یہ بھول جاتے ہیں کہ سپین میں مسلمانوں کے زوال کے بعد اسلام کی شان و شوکت ہندوستان میں منتقل ہوگئی اور جس طرح اسلامی تہذیب و تمدن اور روحانیت نے اہلِ یورپ پر گہرا اثر کیا اسی طرح اسلامی تہذیب و روحانیت نے ہندوؤں کو اسلام کا گرویدہ بنایا۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ

آپ فردوسی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور مزارِ مبارک شہر بہار شریف میں واقع ہے۔ آپ کا بھی ہندو جوگیوں سے بہت مقابلہ رہا اور جب بھی کوئی ہندو جوگی آیا مسلمان ہوا یا ذلیل ہوکر بھاگ گیا۔ ایک دفعہ نیپال کے جنگلوں میں آپ سیاحت کر رہے تھے کہ ہندو لوگوں نے آپ کو گھیر لیا اور وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا لیکن جب آپ نے انکار کیا تو وہ اپنا سب سے بڑا جوگی لائے تاکہ ان کی خبر لے۔ اس نے آتے ہی آپ کو للکارا اور چالیس دن تک بھوکا رہنے کی دعوت دی۔ آپ نے فرمایا چالیس دن تو کوئی چیز نہیں بارہ سال بھوکا رہنے کا مقابلہ کرنا ہے تو آؤ۔ چنانچہ وہ آمادہ ہوگیا۔ آپ نے ایک کنواں کھدوایا اور اس کنوئیں میں دو بڑے بڑے طاق بنوائے۔ ایک طاق میں خود مراقب ہوکر بیٹھ گئے اور دوسرے میں ہندو جوگی کو بٹھایا۔ اس کے بعد لوگوں سے کہا کہ کنوئیں کو اوپر سے گھاس پھونس ڈال کر بند کردیا جائے۔ بارہ سال کے بعد جب دیکھا گیا تو ہندو جوگی کی جگہ پہ ہڈیاں پڑی تھیں اور آپ اسی طرح مراقبۂ ذات

میں مشغول تھے۔

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ آپ سلسلۂ نظامیہ کے بڑے باکمال بزرگ گزرے ہیں آپ کا مزارِ مبارک قصبہ کچھوچھہ صوبہ یوپی (ہندوستان) میں ہے۔ آپ کے ساتھ بھی ہندو جوگیوں نے بہت مناظرے اور مقابلے کئے لیکن ہر دفعہ منہ کی کھائی۔ ایک دفعہ ایک جوگی آپ کے کمالات کا اس قدر معترف ہوا کہ اپنے پانچسو چیلوں سمیت مسلمان ہو گیا۔

حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ آپ کا سلسلہ چشتیہ صابریہ کے اکابر اولیاء میں شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ آپ وحدت الوجود کے قائل تھے لیکن ہندوؤں کے ساتھ اکثر آپ کا مقابلہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے ایک ہندو جوگی کو اپنی کرامت دکھا کر خوب ذلیل کیا۔ وحدت الوجود کے عقیدہ کے باوجود آپ شریعتِ محمدیؐ پر سختی سے پابند تھے آپ کے ملفوظات اور مکتوبات اسلامی تعلیمات سے لبریز ہیں۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ آپ سلسلۂ نقشبندیہ کے اکابر اولیاء میں سے تھے۔ آپ کا مزارِ مبارک سرہند شریف (مشرقی پنجاب) میں ہے آپ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ہمیشہ ہندوستان میں رہے لیکن آپ شریعتِ محمدیؐ پر سختی سے پابند تھے۔ یہاں تک کہ جب اکبر بادشاہ نے اپنی ہندو رعیت کو خوش کرنے کے لئے اُن سے رشتے ناتے کئے اور "دینِ الٰہی" کے نام سے نیا مذہب نکالا جس میں بادشاہ کو سجدہ کیا جاتا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت شیخ نے ڈٹ کر تن تنہا بادشاہ کا مقابلہ کیا اور ساری عمر اسی جدّوجہد میں گذار دی۔ اکبر اعظم اپنی پوری طاقت سے ایک مردِ مومن کا مقابلہ کرتا رہا لیکن بُری طرح ناکام رہا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ آپ بھی سلسلۂ نقشبندیہ کے اکابر اولیاء میں سے تھے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے

علمِ حدیث کی تدوین پر پورا زور دیا اور سارے ہندوستان میں بے شمار دینی مدارس جاری کئے۔ جب آپ نے دیکھا کہ مغلیہ خاندان کمزور ہو چکا اور مرہٹوں کا دہلی پر قبضہ ہوا تو آپ نے احمد شاہ ابدالی والیٔ افغانستان کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ اس مردِ مجاہد نے دعوت کو قبول کیا اور حملہ کر کے مرہٹوں کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ سارے برصغیر میں مسلمانوں کو فوجی لحاظ سے منظم کیا اور دینی لحاظ سے جگہ جگہ پر دینی مدارس جاری کر کے آنے والے نازک دور کے لئے مسلمانانِ ہند کو تیار کیا۔

آپ کی وفات کے بعد یہ کام آپ کے فرزندِ جلیل حضرت شاہ عبدالقادر محدّث دہلویؒ کے سپرد ہوا۔ آپ نے بھی ساری عمر اس کارِ عظیم میں گذار دی اپنی سرپرستی میں ایک ایسی جماعتِ مجاہدین تیار کی جس نے پہلے سکھوں کے خلاف اور اس کے بعد انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد شروع کیا اور صوبۂ سرحد میں انیسویں صدی عیسوی میں پہلا پاکستان قائم کر دیا۔ انگریزوں کے لئے یہ سخت آزمائش کا وقت تھا۔ سکھوں کے ساتھ دو جنگوں میں انگریز بہت کمزور ہو چکے تھے، ان کی چھاؤنیاں خالی پڑی تھیں۔ مجاہدین کے حملے تیز سے تیز تر ہو رہے تھے۔ ولیم ہنٹر نے WILLIAM HUNTER نے اپنی کتاب ہندوستانی مسلمان INDIAN MUSSALMANS میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جب ہماری فوجی قوت مجاہدین کا مقابلہ نہ کر سکی تو ہماری سیاست کام آئی اور ہم نے میدان جیت لیا۔ چونکہ مجاہدین سختی سے شریعت کی پابندی کرتے تھے اور ان میں بعض حضرات ایسے بھی تھے جو امام شافعی علیہ رحمۃ کے پیروکار تھے اور رفع یدین کرتے تھے۔ اس بات سے انگریزوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے مشہور کر دیا کہ مجاہدین وہابی مذہب رکھتے ہیں۔ چونکہ پٹھان لوگ اہلِ سنت وجماعت ہیں اور وہابیت سے سخت متنفر ہیں اس لئے انھوں نے جماعتِ مجاہدین کے خلاف بغاوت کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز غالب آ گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کا پورا خاندان

جو سلسلۂ نقشبندیہ سے تعلق رکھتا تھا نہایت سختی سے برصغیر میں احیائے اسلام کا علمبردار رہا اور اس مہم میں اُنھوں نے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ معلوم نہیں معترضین کس مُنہ سے ایسے مردانِ مجاہد کو ہندو دھرم کا خوشہ چیں کہتے ہیں۔ ان کا نصب العین تو سارے ہندوستان کو مسلمان کرنا تھا۔

علمائے دیوبند علمائے دیوبند بھی چشتی صابری سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور صوفی ہیں اِن میں سے اکثر ہندوستانی اصل کے لوگ ہیں اور سیاست میں اکثر علمائے دیوبند نے ایک نیشن نظریہ ONE NATION THEORY پر عمل کرتے ہوئے ہندو سیاست سے ہم آہنگی کا اظہار کیا اور انڈین نیشنل کانگریس میں بھی شامل ہو کر مسلم لیگ کی مخالفت کرتے رہے لیکن عقائد میں وہ سختی سے شریعت کے پابند تھے یہاں تک کہ وہ وہابی مشہور ہو گئے۔ وہ عرس۔ سماع۔ میلاد اور مزارات پر چڑھاوے چڑھانے نذریں دینے اور منّت ماننے کے سخت خلاف ہیں اور اختلافی مسائل میں نہایت سختی سے مباح امور کو ترک کر کے شریعت کی حاکمیت کو بحال رکھتے ہیں۔ یہ ہے ان لوگوں کی شریعت پسندی جن میں سے بعض حضرات ہندو سیاست سے بھی متفق تھے۔

علمائے دیوبند حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمۃ کے مرید ہیں اور سچے صوفی ہیں لیکن چونکہ اختلافی مسائل میں احتیاط کا پہلو اختیار کرتے ہیں اور مباح کو ترک کر دیتے ہیں اس لئے وہابی مشہور ہو گئے ہیں۔ آپنے بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بے دین انگریزی سلطنت کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور کئی معرکے لڑے لیکن چونکہ آپ کے رفقائے کار کی جماعت قلیل تھی اِس لئے کامیاب نہ ہو سکے اور بالآخر انگریزی حکومت نے آپ کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے جس کی وجہ سے آپ حجازِ مقدس ہجرت فرما گئے۔ اسی طرح آپ کے رفقائے کار اور مخلص مریدین مثل حضرت مولانا محمد قاسمؒ بانیٔ دیوبند اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلاف بھی انگریز دل

نے وارنٹ گرفتاری نکالے اور بغاوت کے مقدمات چلائے۔ صوفیائے دیوبند سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ سے تعلق رکھتے ہیں حنفی مذہب پر کاربند ہیں اور شریعتِ اسلامیہ پر اس سختی سے کاربند ہیں کہ وہابی مشہور ہو گئے ہیں اب آپ خود غور فرما سکتے ہیں کہ ایسے مجاہدین اسلام ہندو مذہب کی کسی چیز سے متاثر ہو سکتے تھے۔ حاجی امداد اللہ بیعت کرنے کے لئے یہ شرط لگاتے تھے کہ صوفی کے لئے اہل سنّت وجماعت کے عقائد کی پابندی ضروری ہے۔

اسی طرح پورے برصغیر میں ہزاروں لاکھوں صوفیائے کرام ہو گذرے ہیں جن کی زندگی اور تصانیف کا مطالعہ کرنے سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے بڑی بڑی مالی اور جانی قربانیاں دے کر تبلیغ اسلام اور ترویج شریعت عمریں گذار دیں اور جہاں کہیں کفر و شرک کا ذرا سا شائبہ نظر آیا پہاڑ کی طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن شریعت پر حرف نہ آنے دیا۔

صوفیائے برِصغیر کا تصوّف

اب ہم مختصر طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ آیا صوفیائے برِصغیر کا تصوّف خالص اسلامی تھا یا اس میں ہندو دھرم کا کوئی عقیدہ شامل ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو دیکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ تصوّف کی حقیقت کیا ہے۔ صوفیائے کرام خواہ وہ برصغیر سے تعلق رکھتے ہیں یا ایران، توران، ترکستان، مصر، شام، مراکو، اندلس، افریقہ اور انڈونیشیا اور چین سے تعلق رکھتے ہیں سب کا تصوف چار چیزوں پر مشتمل ہے شریعت طریقت، معرفت اور حقیقت۔ اس قول کی بنیاد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے:-

"اَلشَّرِیْعَتُ اَقْوَالِیْ وَالطَّرِیْقَتُ اَفْعَالِیْ وَالْمَعْرِفَۃُ اَحْوَالِیْ وَالْحَقِیْقَتُ سِرِّیْ۔" (شریعت میرے اقوال ہیں، طریقت میرے افعال ہیں، معرفت میرے احوال (کیفیات) ہیں اور حقیقت میرا راز ہے) یہ حدیث برصغیر کے سب سے

بڑے دارالعلوم یعنی دیوبند کے بانی بلکہ اُن کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے اپنی شرح مثنوی مولانا روم کے پہلے صفحہ پر نقل کی ہے اسی حدیث کے لگ بھگ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قول ہے جو شریعت، فقہ اور تصوف کی ہم آہنگی پر بیّن دلیل ہے۔ آپ فرماتے ہیں :-

مَن تَصَوَّفَ وَلَا تَفَقَّہَ تَزَنْدَقَ مَنْ تَفَقَّہَ وَلَا تَصَوَّفَ تَفَسَّقَ مَنْ تَصَوَّفَ وَتَفَقَّہَ تَحَقَّقَ (جس نے تصوّف سیکھا اور فقہ نہ سیکھا وہ گمراہ ہوا جس نے فقہ سیکھا اور تصوّف نہ سیکھا وہ فسق و فجور میں مبتلا ہوا۔ جس نے تصوّف اور فقہ دونوں کو جمع کیا وہ حقیقت کو پہنچا۔) اب دیکھنا یہ ہے کہ تصوّف کے ان چار ارکان سے کیا مراد ہے۔ جاننا چاہیئے کہ شریعت کی حیثیت ایک نسخہ یا دستور العمل کی ہے۔ دستورِ عمل پر عمل کرنا طریقت ہے یعنی راستے پر چلنا۔ معرفت سے مراد ہے جاننا یا پہچاننا اور جس چیز کو سالک یہ منازل طے کر کے جان لیتا ہے یا پہچان لیتا ہے تو اُسے حقیقت کہتے ہیں۔ اب آپ اسلامی دُنیا کے جس گوشے میں جائیں ہر جگہ صوفیا کے ہاں تصوّف کی یہی تعریف ملے گی۔ صوفیائے برصغیر نے بھی اپنے عربی، ایرانی اور ترکستانی مشائخ کرام سے یہی تصوف سیکھا اور آج تک اسی پر قائم ہیں چونکہ مسلم عوام کو ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس بات کا ڈر ضرور تھا کہ ہندوؤں کے غلط اور غیر شرع عقائد مسلمانوں کی زندگیوں میں داخل ہو جاتے۔ اِس لئے صوفیا رکرام نے شریعتِ اسلامیہ کے عقائد پر بڑی بڑی کتابیں لکھ کر واضح کر دیا کہ ہندوؤں کے رسوم و رواج مشرکانہ ہیں اور اُن سے مسلمانوں کو بچ کر رہنا ہے۔ اس سلسلہ میں صوفیائے اسلام مثل مولانا اشرف علی تھانوی (دیوبندی) کی کتاب "بہشتی زیور"۔ شاہ اسمٰعیل شہید کی کتاب تقویت الایمان، شاہ ولی اللہ کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" اور تحفۃ الموحدین، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی "ارشاد الطالبین" کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ان حضرات نے کن کاوشوں سے عقائد تصوّف و شریعت کو غیر اسلامی عقائد کے ساتھ مخلوط ہونے سے

محفوظ رکھا۔ یہ کتابیں برصغیر کے صوفیائے کرام کی تصانیف ہیں۔ آپ بعینہٖ یہی باتیں صوفیائے عرب، ایران، ترکستان اور افریقہ وغیرہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہی چیز آپ غوث الاعظم، شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادیؒ کی کتاب "غنیۃ الطالبین"، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی کتاب "عوارف المعارف"، ابوطالب مکی کی کتاب "قوت القلوب" ابونصر سراج کی کتاب "لمعات" مولانا جامیؒ کی کتاب "لوائح و لوامع"۔ کلاآبادیؒ کی کتاب "تعرف فی مذہب تصوف"، اور محی الدین ابن عربی کی کتاب "فتوحاتِ مکیہ" میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ صوفیائے کرام خواہ وہ عرب سے تعلق رکھتے تھے، ایران سے، ترکستان سے یا افریقہ اور یورپ سے سب کا سرچشمہ شریعتِ محمدی اور قرآن وحدیث اور فقہ اسلامیہ ہے۔

سلوک الی اللہ کی بنیاد شریعت ہے

اب ہم وہ چیزیں بتاتے ہیں جس پر یورپ کے مصنفین نے کبھی غور نہیں کیا۔ اگر اس بات کا جائزہ لیتے تو تصوف پر ہرگز اعتراض نہ کرتے۔ تصوف کے عقائد اور احوال تو آپ نے دیکھ لئے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ کے عین مطابق ہیں اب یہ دیکھنا ہے کہ سلوک الی اللہ یعنی روحانی کورس SPIRITUAL COURSE جو مشائخ عظام نے اسلام کے عام عبادات کے پروگرام کے علاوہ مقرر کیا ہے وہ کیا ہے آیا اس کے اندر یونان ایران، عیسائیت اور ہندو اور بدھ مذاہب کی کوئی چیز شامل ہو گئی ہے یا خالصتاً اسلامی ہے۔ اس سلسلہ میں پوری اسلامی دنیا کے صوفیائے کرام کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ملک اور ہر خطہ میں مشائخ عظام کی تعلیمات عام نماز روزہ حج زکوٰۃ کے علاوہ ذکر نفی اثبات یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اور ذکر اسم ذات یعنی اللہ اللہ کی کثرت پر مبنی ہیں اور یہ ذکر انھوں نے قرآن وحدیث سے لیا ہے۔ قرآن عظیم میں جگہ جگہ کثرتِ ذکرِ الٰہی کی تلقین کی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ - نیز فرمایا، وَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا

وَعَلٰی جُنُوْبِکُمْ (یعنی اُٹھتے بیٹھتے اور سوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہو) نیز فرمایا رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ بَيْعٌ وَّلَا تِجَارَةٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (ایسے مردانِ خدا بھی ہیں جن کو اپنا کاروبار اللہ کے ذکر سے نہیں روک سکتا) غرضیکہ قرآن مجید میں کثرت سے ذکر اللہ کی تلقین کی ہے۔

احادیثِ نبویؐ میں ذکر اللہ کی تاکید

اسی طرح احادیثِ نبویؐ میں بھی کثرتِ ذکر کی تاکید آئی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی زندگیاں ذکرِ الٰہی سے بھرپور نظر آتی ہیں۔ نیز ذکر کا خاص طریق جو صوفیاء کرام کا ایجاد کردہ بتایا جاتا ہے وہ بھی احادیث سے ثابت ہے۔ حضرت شدّاد بن اوس روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کوئی غریب (اجنبی جس سے مراد اہلِ کتاب تھی) ہے۔ عرض کیا جی نہیں۔ آپ نے فرمایا دروازہ بند کر لو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھوں کو اوپر اُٹھاؤ اور لا الٰہ الا اللہ کہو۔ ہم سب نے اسی طرح کیا۔ کچھ دیر کے بعد آپ نے اپنا ہاتھ اپنی جگہ پر رکھ دیا اور فرمایا الحمد للہ اے اللہ تو نے مجھے کلمہ کے لئے مبعوث فرمایا تھا اس کلمہ کا حکم فرمایا تھا اور اس کلمہ پر جنّت کا وعدہ فرمایا ہے۔ آپ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں کہ اللہ نے تمہیں بخش دیا۔ اسی طرح یہ ذکر صحابۂ کرام سے تابعین اور تابعین سے تبع تابعین اور ان سے آج تک صوفیاءِ کرام کے تمام سلاسل میں جاری ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا سہل ترین راستہ دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ خلوت میں ذکر اللہ کی مداومت کرو۔ میں نے عرض کیا کس طرح آپؐ نے فرمایا آنکھیں بند کرو اور مجھ سے سنو۔ پس آپ نے تین بار لا الٰہ الا اللہ کا ذکر کیا اور میں سُنتا رہا۔ اس کے بعد تین بار میں نے ذکر کیا اور آپؐ سُنتے رہے۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے امام حسن بصریؒ کو اور اُنھوں نے

عبدالواحد بن زید اور حبیب عجمی وغیرہ صوفیاء کرام کو تلقین کیا اور یہی ذکر عرب وایران اور ترکستان سے اولیاء کرام لے کر ہندوستان آئے اور اپنے مریدین کو تلقین کیا جو آج تک جاری ہے اور اسی ذکر کی بدولت طالبان راہِ حق اللہ تعالےٰ تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں ہندو دھرم کی کونسی چیز شامل ہوگئی ہے۔ جہاں تک عقائد کا تعلق ہے ہندو دھرم میں بُت پرستی۔ تناسخ اور دیگر غیر اسلامی عقائد آج تک چلے آرہے ہیں لیکن صوفیائے کرام نے ان سے نہ صرف اجتناب کیا بلکہ سختی سے ان کی تردید کی، اسلام کی تبلیغ میں سرگرم رہے اور ہزاروں لاکھوں ہندوؤں کو مشرف باسلام کیا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب "قول الجمیل" اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی کتاب "ضیاء القلوب" میں سلوک الی اللہ کے مختلف اذکار اور مراقب اور مشاغل تفصیل سے درج ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ یہ تمام اذکار و مشاغل وہی ہیں جو قرآن وحدیث میں مروی ہیں۔ نیز تمام مشائخ کے طریقِ بیعت کے ملاحظہ سے ظاہر ہے کہ بیعت کرتے وقت مریدین سے اقرار کراتے ہیں کہ اللہ ایک ہے نبیؐ برحق ہے۔ دوزخ وبہشت برحق ہیں غرضیکہ ایمان کی شرائط کا اُن سے عہد لیا جاتا ہے اور کلمۂ طیبہ اور کلماتِ شہادت کا اعادہ کرایا جاتا ہے اور ہر کام اور ہر حال میں شریعت پر پابند رہنے کی تاکید کی جاتی ہے۔

لنڈن اور پیرس میں بیٹھے ہوئے مختلف یونیورسٹیوں کے عربی اور فارسی کے پروفیسر جن کو اسلام کی نکتہ چینی پر کتابیں لکھنے کے لئے لاکھوں پونڈ کی رقومات حکومت کی طرف سے ملتی ہیں کاش وہ لوگ اسلامی ممالک میں جاکر صوفیاء کرام سے ملتے اور ان کی کتابوں میں سلوک الی اللہ یعنی روحانی کورس کے متعلق اذکار ومشاغل کا مطالعہ کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ ان میں شریعت کے سوا کوئی چیز نہیں بلکہ اگر شریعت کا حقیقی معنوں میں وجود ہے تو صرف صوفیاء کرام کی تعلیمات اور ان کی عملی زندگی میں ہے کیونکہ صوفیاء کرام کے ہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور اسوۂ حسنہ کی ظاہری اور باطنی دونوں قسم

کی اتباع کا بندوبست کیا گیا ہے۔ لیکن علمائے ظاہر اسوۂ حسنہ اور سنّت نبوی کا صرف ظاہری اتباع کرتے ہیں لیکن باطنی اتباع کو نظر انداز کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ظاہری علماء آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نمازیں تو پڑھتے ہیں روزے بھی رکھتے ہیں۔ آپ کی طرح زندگی بسر بھی کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن آں حضرتؐ کی عبادت کی غرض و غایت اور زندگی کا مدعا اور مقصد یعنی قرب الی اللہ اور وصال حق جو تھا اس کے حصول کی یہ لوگ کوشش نہیں کرتے۔ شریعتِ اسلامیہ کے دونوں پہلوؤں یعنی ظاہری اور باطنی دولت سے صرف صوفیائے کرام مالا مال ہیں۔ یہی وجہ ہے ان حضرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثہ میں دولتِ کشف و کرامات بھی حاصل ہے لیکن علمائے ظاہر اس سے محروم ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب صوفیائے کرام کے ظاہری اور باطنی کمالات اور شریعت کی حقیقی پابندی کو دیکھ کر تمام خاص و عام ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں تو علمائے ظاہر کو ان سے حسد پیدا ہوتا ہے اور اُن پر طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں اور ان کی ہر بات کو خلافِ شرع ثابت کرنے کی سعیِ ناکام میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ:-

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ائمہ مجتہدین اور تصوّف تصوّف کی شرعی حیثیت کی اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ خود ائمۂ اربعہ یعنی امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ جنہوں نے شریعتِ اسلامیہ کو مرتب کرنے اور تبلیغ دینِ متین میں ساری عمریں صرف کر دیں تصوف کے بڑے حامی تھے۔ اگر تصوّف شریعت کے خلاف ہوتا تو سب سے پہلے وہ اسی کی تردید کرتے لیکن تردید تو کجا انھوں نے تو بجائے خود نہ صرف تصوّف کی زبردست حمایت کی بلکہ صوفیائے وقت سے اُنھوں نے روحانی فیضان حاصل کیا اور بلند روحانی منازل پر پہنچ گئے۔

امام مالکؒ آپ امام شریعت و طریقت تھے۔ ساری عمر آپ نے مدینہ میں اس

غرض سے گزاری کہ شاید باہر جاؤں اور وہاں مر کر مدینہ سے محروم ہو جاؤں۔

امام ابو حنیفہؒ

حضرت امام ابو حنیفہؒ نہ صرف صوفی تھے بلکہ اکابر صوفیاء مثل فضیل ابنِ عیاضؒ، حضرت ابراہیم بن ادھمؒ، حضرت بشر حافیؒ اور حضرت داؤد طائیؒ کے اُستاد بھی تھے۔ جب آپ نے روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہو کر "السلام علیکم یا سید المرسلین" کہا تو "وعلیکم السلام یا امام المسلمین" کا جواب ملا۔ آپ نے روحانی فیض حضرت امام جعفرِ صادق رضی اللہ عنہٗ سے حاصل کیا۔ ایک دفعہ کسی نے آپ سے عُمر دریافت کی تو فرمایا ڈھائی سال ہے۔ جب اس آدمی نے حیران ہو کر مزید پوچھا تو فرمایا کہ ڈھائی سال ہوئے مجھے امام جعفرِ صادقؒ کی خدمت میں فیض یاب ہونے کا موقع ملا پس میں سمجھتا ہوں کہ اُسی وقت پیدا ہوا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ لَوْلَا السَّنَتَانِ لَهَلَكَ النُّعْمَانُ (اگر امام جعفر صادق کی صحبت کے دو سال نہ ملتے تو میں ہلاک ہو جاتا۔

امام شافعیؒ

حضرت امام شافعیؒ نہ صرف شریعت کے امام تھے بلکہ طریقت میں بھی آپ کا درجہ بلند تھا۔ مشہور صوفی بزرگ حضرت بلال خواصؒ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ امام شافعی اوتاد ہیں۔ یاد رہے کہ اوتادؔ نظامِ باطنی میں ایک عہدہ ہے۔ حضرت عبد اللہ انصار فرماتے ہیں کہ میں امام شافعیؒ کا مقلّد تو نہیں ہوں لیکن ان کو دوست رکھتا ہوں۔ امام صاحب خود فرماتے ہیں کہ خواب میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے منہ میں لعابِ دہن ڈالا اور فرمایا جاؤ اب اللہ تعالےٰ برکت دے گا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے اپنی انگشتری اُتار کر مجھے عطا کی۔

امام احمد بن حنبلؒ

حضرت امام احمد بن حنبلؒ شریعت کے امام تھے اور طریقت میں آپ حضرت بشر حافی قدس سرہٗ کے مرید تھے۔ حضرت بشر حافیؒ کی سواری کے ساتھ امام احمدؒ رکاب تھام کر چلتے تھے۔ جب کوئی شخص آپ سے کوئی مسئلہ پوچھتا تو اگر فقہ کے متعلق ہوتا تو خود جواب دیتے تھے اگر حقائق کے متعلق ہوتا تو

حضرت بشر حافی کے پاس بھیج دیتے تھے۔ جب آپ کی وفات ہوئی تو گرمی کا موسم تھا۔ یہ دیکھ کر جنگلی پرندے کثیر تعداد میں آگئے اور آپ کے جنازہ پر سایہ کر دیا۔ آپ کی اس کرامت کو دیکھ کر دو ہزار کافر اسلام سے مشرف ہوئے۔

یاد رہے کہ بعض محدثین اور متکلمین کو شروع میں صوفیا کرام سے اختلاف رہا۔ مگر بعد میں اللہ تعالےٰ نے انہیں بھی بصیرت عطا فرمائی اور وہ اپنی سابقہ روش سے تائب ہوئے اور صوفیاء کی جانب رجوع کیا۔ چنانچہ امام مالک اور امام احمدؒ شروع میں صوفیاء کے خلاف تھے لیکن بعد میں اُن سے فیض حاصل کیا۔ امام غزالیؒ بھی شروع میں علوم ظاہری میں منہمک رہے۔ لیکن بعد میں تصوّف کی طرف رجوع کیا۔ اسی طرح امام ابوالحسن ابن حزمؒ اور امام ابن جوزیؒ نے جو شروع میں صوفیاء کے مخالف تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خواب میں تازیانہ کے بعد تصوّف اختیار کیا۔ چنانچہ ان کی بعد کی تصانیف مثل صفوۃ الصفوہ اور ثبات عند الممات میں تصوّف بھرا پڑا ہے۔ اسی طرح قاضی شوکانی یمنی جو امام ابنِ تیمیہ کے پیرو تھے اور صوفیاء کرام کے سخت مخالف تھے بعد میں راہِ راست پر آ گئے۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو المعتقد المنتقد مصنفہ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی۔ جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ کافی عرصہ تک شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی تکذیب و تکفیر کے بعد قاضی شوکانی یمنی اس سے باز آگئے اور حضرت شیخ کی صداقت کے قائل ہوئے۔

آخر میں ہم ان لوگوں سے پوچھتے ہیں اگر صوفی حضرات دوسرے مذاہب کی روحانیت دیکھ کر اسلام سے باغی ہو گئے تھے تو پھر انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کیوں لمبے لمبے قصیدے اور نعتیں لکھی ہیں۔ مولانا جامیؒ بھی صوفی تھے لیکن عشق رسولؐ میں دیوانہ تھے۔ اس جوشِ عشق میں آکر عرض کرتے ہیں ؎

زشوقت جاں بلب آمد تمامی
فقم قُم یا حبیبی کم تنَامی

نیز عرض کیا ؎

نسیما جانب بطحا گذر کن
ز احوالم محمدؐ را خبر کن

نیز عرض کیا ؎

یا رسول اللہ بدرگاہت پناہ آوردہ ام
ہمچو کاہے عاجزم کوہِ گنہ آوردہ ام

اسی طرح سعدیؒ بھی صوفی تھے آپ نے رسول اللہؐ کی شان میں یہ رباعی کہہ کر عاشقانِ رسول کو ہمیشہ کے لئے تڑپا دیا ؎

بلغ العلےٰ بکمالہٖ　　کشف الدجےٰ بجمالہٖ
حسُنت جمیعُ خصالہٖ　　صلوا علیہ و آلہٖ

حضرت شاہ عبدالقادر محدّث دہلویؒ بھی صوفی تھے۔ اُنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کس طرح یہ رباعی کہہ کر عاشقوں کے دلوں کو ہلا دیا ؎

یا صاحب الجمال و یا سیّد البشر　　من وّجہک المنیر لقد نوّر القمر
لا یمکن الثناءُ کما کانَ حقہٗ　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

حضرت شمس تبریزیؒ بھی صوفی تھے بلکہ مست قلندر تھے۔ اُنھوں نے کس طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی کی ہے ؎

یا رسول اللہ حبیب خالقِ یکتا توئی　　برگزیدہ ذوالجلال پاک بے ہمتا توئی
نازنینِ حضرتِ حق صدر و بدرِ کائنات　　نورِ چشم انبیاء چشم و چراغِ ما توئی
شمس تبریزیؒ چہ داند نعتِ تو پیغمبرا
مصطفےٰ و مجتبےٰ و سیّدِ اعلیٰ توئی

غرضیکہ صوفیائے کرام کے نزدیک مدحتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مضمون اس قدر وسیع ہے کہ اگر تمام مشائخ عظام کا نعتیہ کلام جمع کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں وجود میں آجائیں گی۔

پھر بھی یہ لوگ کس دیدہ دلیری اور جسارت سے یہ الزام لگاتے ہیں کہ صوفی لوگ اسلام کو ترک کر کے دوسرے مذاہب کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ ہمارے خیال سے یہ بہت بڑی بین الاقوامی سکیم ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کی سب سے بڑی دولت اور سب سے بڑی طاقت یعنی تصوّف اور روحانیت کو بدنام کر کے مسلمانوں کو کمزور کیا جائے کیونکہ دشمنانِ اسلام کو معلوم ہے کہ اسلام کی ترقی اور فتوحات کی اصلی وجہ ہی یہی روحانیتِ اسلام ہے۔

معترضین یہ بات نہیں سمجھ سکے کہ تصوف یا اسلامی علمِ روحانیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات نقطۂ مرکزی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جملہ صوفیاء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ مصدرِ فیض ذاتِ حق ہے لیکن اس کا دروازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آں حضرتؐ کی روحانی توجّہ کے بغیر کوئی صوفی یا ولی اللہ روحانی مدارج طے نہیں کر سکتا۔ مقامِ فنا فی اللہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ مقام فنا فی الرسول حاصل نہ ہو اور مقام فنا فی الرسول اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ مقام فنا فی الشیخ حاصل نہ ہو اور مقام فنا فی الشیخ اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ شریعتِ محمدیؐ پر سختی سے عمل نہ کیا جائے۔ معترضین تو یہ الزام لگاتے ہیں کہ صوفیاء نے اسلام سے باغی ہو کر دوسرے مذاہب سے روحانیت حاصل کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شریعت محمدیؐ سے ذرا بھر تجاوز کرنے سے نہ صرف ترقی رُک جاتی ہے بلکہ اوپر کے مقام سے گر کر وہ نیچے جا پڑتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صوفیاء کے قلوب پر ہر لحظ اور ہر آن فیضان کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان رُک جائے تو اسلام ختم ہو جائے۔ چودہ سو سال تک اسلام کے اُسی آن بان سے زندہ رہنے کا سبب یہی اور صرف یہی ہے کہ مسلمانوں کے قلوب پر سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فیضان کی بارش ہو رہی ہے اور تا قیامت بلکہ قیامت کے بعد ابد الآباد تک ہوتی رہے گی۔

خلاصہ

کافی دُنیا کتاب ہٰذا کے مطالعہ سے آپ نے دیکھ لیا کہ اسلام سائنس کے خلاف نہیں بلکہ دنیا میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو سائنس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ موجودہ دنیا نے سائنس کے میدان میں ضرور ترقی کی ہے لیکن یہ ترقی صرف محدود عقل کی بناء پر کی ہے یعنی صرف جسمانی آنکھ سے دیکھ کر کی ہے۔ اگر اس کے ساتھ روحانی اور باطنی آنکھ بھی شامل ہوجائے تو کیا کہنے۔ پھر اس تیزی سے ترقی ہوگی کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محدود آنکھ سے آپ حقیقت اشیاء معلوم نہیں کرسکتے۔ یہاں تک کہ آپ ایک گھاس کے تنکے کی حقیقت بھی نہیں معلوم کرسکے۔ باطنی آنکھ کے کھل جانے کے بعد جب خالق کائنات کی حقیقت اور عرفان آپ کو حاصل ہوجائے گا تو مخلوق کی حقیقت خود بخود آشکارا ہوجائے گی۔ نیز حق تعالیٰ کی معرفت کے بعد جب آپ پر حقیقتِ انسان اور مقصدِ حیات واضح ہوجائے گا تو آپ کو خود بخود حق و باطل میں تمیز کرنے کا معیار حاصل ہوجائے گا۔ اس وقت حق و باطل کی پہچان کا دُنیا کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ سائنس نے انسان کو کوئی اخلاقی دستور العمل نہیں دیا ہے جس سے وہ بتا سکے کہ یہ چیز اچھی ہے یہ بُری ہے۔ تہذیب مغرب میں اچھی چیز وہ ہے جو قوم کے حق میں اچھی ہے اور بری چیز وہ ہے جو قوم کے لئے بُری ہے اس سے سارا جھگڑا کھڑا ہوگیا ہے اور ہر شخص اپنی قوم کی خاطر دوسری قوموں کا حق مارنے پر آمادہ ہوگیا ہے۔

باطنی آنکھ کھلنے کا تیسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کی کائنات کے بادشاہ تک رسائی ہو جائے گی بلکہ آپ اس کے منظورِ نظر بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو میرا ہو جاتا ہے میں اس کا ہو جاتا ہوں۔ پس اللہ آپ کا ہو جاتا ہے اس کے بعد ساری کائنات آپ کی ہے اور کیا چاہئے۔ یہ زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ اس کوچے میں آکر دیکھ لیں کہ کیا کیا مزے ہیں۔ یہاں محنت بھی کم لگتی ہے۔ دنیا کے باقی کاموں میں آپ جس قدر محنت اور مشقت کرتے ہیں اگر آپ اُس کا دسواں یا سواں حصّہ بھی اس کام میں لگائیں تو بفضلہٖ تعالیٰ آسانی سے منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ غرضیکہ یہ وہ کوچہ ہے جہاں محنت کم ہے اور مزدوری بیش بہا ہے۔

وحدت الوجود کے متعلق سخت تنبیہ

آخر میں ہم ناظرین کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ وحدت الوجود کا مسئلہ صحیح ہے اور کاملین نے اس کی تصدیق کی ہے لیکن یہ مسئلہ اس طرح نہیں جس طرح کہ جاہل اور کام چور صوفیوں نے سمجھ رکھا ہے۔ حضرت مولانا رومؒ جو بہت بڑے صوفی ہیں فرماتے ہیں ؎

اتصال بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را باجانِ ناس

جس شخص کو اس شعر کا مطلب سمجھ نہ آئے سمجھ لو کہ وہ صوفی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایسا تعلق ہے کہ نہ اس کی کوئی کیفیت بیان کی جا سکتی ہے اور نہ وہ خیال میں آسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جہت و طرف اور مکان و زمان سے پاک اور منزّہ ہے لہٰذا اس کی حقیقت سمجھنے کے لئے آدمی کو خود زمان و مکان کی قید سے آزاد ہونا پڑتا ہے اور پھر جا کر وحدت الوجود کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہونے کے لئے اسلامی شریعت کے پروگرام یعنی ظاہری نماز اور روزہ کے علاوہ زائد کام کرنا پڑتا ہے۔ اذکار و مشاغل کے ذریعے دل پر جو زنگ چڑھ چکا ہے اُسے دھونا پڑتا ہے اور شیشۂ دل کو صاف اور شفاف کر کے قوّتِ پرواز بڑھائی جاتی

ہے۔ وحدت الوجود کی حقیقت کتابوں میں پڑھ لینے اور کسی کی زبانی سُن لینے سے آشکارا
نہیں ہوتی۔ اس لئے آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جو شخص شریعت کا تارک ہے اور
ہمہ اوست کے نعرے مار رہا ہے وہ تصوّف اور اسلام سے ناواقف ہے۔ جاہل ہے
بے دین ہے۔ ٹھگ ہے۔ راہزن ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جو حضرات ہر وقت ہر
لحظہ اور ہر آن بحرِ وحدت میں غرق ہیں اور ان کو ذات و صفاتِ حق میں فنا حاصل ہے وہ
تو نماز روزہ، حج زکوٰۃ اور دیگر ارکانِ شریعت کی سختی سے پابندی کریں ساری رات
نوافل اور تلاوت اور ذکر و شغل میں گزار دیں اور چالیس چالیس سال تک عشار کی نماز
کے وضو کے ساتھ فجر کی نماز ادا کریں لیکن یہ تن پرور موٹے جھوٹے جاہل صوفی وحدت الوجود
کی آڑلے کر نماز اور روزہ ترک کر دیں۔ یہ کیا مذاق ہے ان کو کھانے پینے، توند بڑھانے
زلفیں بڑھانے، بناؤ سنگھار کرنے، روپیہ پیسہ بٹورنے کا ہوش تو ہے لیکن ہوش
نہیں تو نماز اور روزہ کا یا شریعت کی پابندی کا نہیں ہے۔ یہ لوگ اسلام اور تصوف کے
دشمن ہیں۔ عوام الناس کے لئے ٹھگ اور راہزن ہیں۔ وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو
بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اچھے خاصے صوم و صلوٰۃ کے پابند مسلمان جب
ان کی صحبت میں گئے تو بالکل گمراہ ہو کر نماز روزہ چھوڑ بیٹھے اور وہی ہمہ اوست کی باتیں کرنے
لگے۔ ہمہ اوست درست ہے۔ لیکن ہمہ اوست کی گرد تک یہ لوگ نہیں پہنچ سکے نہ اس
کی بو تک ان کو آئی ہے۔ بس کتابوں میں پڑھ کر اور جاہل صوفیوں کی باتیں سُن کر خود ساختہ
صوفی بن گئے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو دیکھ کر لوگ تصوّف سے متنفر ہو گئے ہیں۔ لہٰذا
ان لوگوں کی باتیں نہیں سُننی چاہئیں۔ صوفیوں اور ہمہ اوستیوں کے سردار حضرت منصور
الحلاج جنہوں نے نعرۂ اناالحق مارا ان کی پابندئ شریعت کا یہ عالم تھا کہ ہر رات پانچ سو
رکعت نفل ادا کرتے تھے اور جیل خانہ میں بھی تلاوتِ قرآن میں مصروف رہتے تھے۔ صوفیوں
کے ایک اور سردار حضرت بایزید بسطامیؒ جنہوں نے "سبحانی" کا نعرہ مارا۔ جب ہوش میں
آئے تو مریدین کو حکم دیا اگر مجھ سے یہ کلمات پھر سرزد ہوں تو مجھے قتل کر دینا۔ آپ کی پابندئ شریعت

شاہ صاحب اسی کتاب میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ شرف زیارت ہوا تو میں نے آں حضرتؐ سے عرض کیا کہ حضور فضیلتِ صحابہ کے بارے میں کیا حکم ہے تو فرمایا کہ شیخین یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت عمر رضؓ حضرت علیؓ سے افضل ہیں کیونکہ وہ حامل احکام نبوت ہیں اور (حضرت) علیؓ حامل احکام ولایت ہیں اور نبوت افضل ہے ولایت سے یہاں سے بھی شریعت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

علمائے ظاہر نے تصوف کے خلاف جو کچھ لکھا ہے وہ ان نام نہاد جاہل غیر متشرع صوفیوں کے خلاف لکھا ہو گا جو وحدت الوجو: کی آڑ میں شکار کھیلنا چاہتے ہیں اور نماز روزہ سے جی چُراتے ہیں۔ اسی طرح امام ابنِ [illegible] نے جو تصوف کی مخالفت کی وہ بھی کسی حد تک جائز تھی کیونکہ اس وقت اسلامی دنیا بڑے نازک دور سے گذر رہی تھی قرامطہ کا [illegible]۔ معتزلہ فرقے [illegible] حامی خود بادشاہِ وقت ہو گیا تھا۔ علماء کرام اور ائمہ مجتہدین کو سخت سے سخت سزائیں دی جا رہی تھیں۔ مجوسی لوگ وحدت الوجود، حلول اور الحاد کے نعرے مار رہے تھے۔ چنگیزی لوگ اسلامی سلطنت کو برباد کر رہے تھے لہٰذا امام موصوف نے کمال احتیاط سے کام لیتے ہوئے شریعت کا علم بلند کیا اور وحدت الوجود کی بھی مخالفت کی لیکن یہ مخالفت نیک نیتی پر مبنی تھی۔ اس وقت چونکہ حالات بدل چکے ہیں اِس لئے امام موصوف کے مخالفین اور مقلدین دونوں کو چاہئے کہ اپنا اپنا رویہ بدل دیں۔ آپ کے مخالفین کو یہ دیکھنا چاہئے کہ وحدت الوجود نہایت نازک، لطیف اور ادق مسئلہ ہے۔ اس میں اگر جاہل صوفیوں کی طرح بے لگام ہو کر بات چیت کی جائے تو فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ کے مقلدین کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اولیاء کرام کا مسلک حق پر ہے وہ بھی صحیح معنوں میں شریعت کے پابند ہیں خود امام موصوف اولیاء کرام کے مقامات مثلاً فنا فی اللہ، بقا باللہ، فرق و جمع، سکر و صحو، استغراق و مستی کے قائل ہیں اس لئے علماء ظاہر کو چاہئے کہ تصوف کی مخالفت نہ کریں۔

شیطانی حملے آج ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ یہ وقت

آپس میں لڑنے کا نہیں ہے بلکہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ لڑنے کا ہے جو مسلمانوں کے خلاف چاروں طرف سے حملہ آور ہیں۔ اس وقت اسلام کے خلاف زبردست شیطانی حملے ہو رہے ہیں اگر ہم نے رواداری اختیار کر کے اپنے معمولی فروعی اختلاف ختم نہ کئے اور آپس میں لڑ لڑ کر اپنی طاقت ضائع کر دی تو دشمنانِ اسلام سے کون لڑے گا؟

اختلاف کی اور وجہ

اختلاف کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے لوگ آپس میں ضد اور عناد رکھتے ہیں اور حقیقت سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جب تک ضد اور عناد کو ختم نہیں کیا جائے گا صلح کی صورت نہیں نکلے گی اور عناد تصوف سے ختم ہوتا ہے یعنی من مارنے سے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ فروعی اختلافات کو بعض لوگوں نے دنیاوی اغراض کی خاطر فروغ دے رکھا ہے۔ اگر مسائل پیدا نہ کریں تو ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل تمام فرقوں کے مبلغین میں سے زیادہ مشہور و معروف وہی ہیں جو دوسرے فرقے کے لوگوں کو زیادہ گالیاں دے سکتے ہیں اس سے بچارے سادہ لوح مسلمان خوش ہو جاتے ہیں اور روپوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔

اختلافات دشمنان اسلام کے پیدا کردہ ہیں

در اصل یہ اختلافات دشمنانِ اسلام کے پیدا کردہ ہیں تاکہ مسلمان آپس میں لڑتے رہیں اور وہ لوگ ان پر حکومت کرنے کے قابل ہو سکیں۔ سب سے پہلے مسلمانوں کے درمیان اختلافات یہودیوں نے پیدا کئے اور صحابۂ کرام کے مابین غلط فہمی پیدا کر دی۔ اس کے بعد اقوامِ مغرب نے جب اسلامی دُنیا پر قبضہ کیا تو مسلمانوں میں فرقہ وارانہ اختلافات پیدا کر کے ایسا لڑایا کہ غیر ملکی حکمران چلے گئے ہیں لیکن لڑائی جاری ہے۔

بریلوی، دیوبندی اور شیعہ سنّی اختلافات کو انگریزوں نے نہایت چالاکی سے ہوا دی۔ بڑی بڑی رقومات اس انداز سے فریقین کو پیش کی گئیں کہ ان کے وہم و گمان میں نہ آ سکا کہ یہ شرارت ہے۔ اُن کے مدارس کو امدادی رقوم عطا کیں، ان کی اختلافی کتابوں کو اپنے خرچ سے چھپوایا غرضیکہ طرح طرح کے حربے استعمال کر کے امتِ محمدیہ کو ٹکڑے ٹکڑے

کر دیا۔ لہٰذا اب ہوش میں آنے کا وقت ہے۔ پانی گردن تک پہنچ چکا ہے

ولیم ہنٹر اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" INDIAN MUSSALMAN میں مجاہدین کی جماعت کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ جب ہم اپنی فوجی طاقت سے سید احمد شہیدؒ کی جماعت کا مقابلہ نہ کر سکے تو برٹش حکمت عملی DIPLO - MACY کام آئی۔ یعنی انھوں نے یہ کہہ کر کہ مجاہدین وہابی ہیں پٹھانوں کو اُن سے علیحدہ کر دیا بلکہ خود پٹھان مجاہدین کے خلاف لڑنے لگے اس سے سارا کام خراب ہو گیا اور شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ اور سید احمدؒ بریلوی نے جو ہندوستان پر اسلامی حکومت قائم کرنے کی اسکیم بنائی تھی سب خاک میں مل گئی۔

تاریخ شاہد ہے کہ آج تک مسلمانوں نے کسی میدان میں غیر مسلموں سے شکست نہیں کھائی۔ جنگ اُحد میں قریشِ مکہ میدان چھوڑ کر چلے گئے تھے اور آں حضرتؐ نے اُن کا تعاقب کیا۔ کیا شکست خوردہ فوج بھی دشمن کا تعاقب کر سکتی ہے۔ اسی طرح فرانس کی جنگِ ٹورز TOURS کو بھی عیسائی مورخین نے توڑ موڑ کر مسلمانوں کی شکست ظاہر کیا ہے حالانکہ بات یہ تھی کہ جب مسلمان تھوڑی فوج کے ساتھ فرانسیسی فوج کا تعاقب کرتے کرتے نصف سے زیادہ فرانس فتح کر کے ٹورز کے مقام تک پہنچ گئے تو انھوں نے سوچا کہ سپین سے دور اب یہاں رہنا مشکل ہے اس لئے وہ رات کے وقت وہاں سے واپس چلے آئے۔ مسلسل شکستوں کے بعد جب اہل یورپ نے دیکھا کہ مسلمان واپس چلے گئے ہیں تو انھوں نے آرام کا سانس لیا۔ اور یہ مشہور کر دیا کہ ہم نے مسلمانوں کو شکستِ فاش دے کر بھگا دیا ہے۔

غرضیکہ تاریخ اسلام میں کسی جگہ یہ ثبوت نہیں ملتا کہ مسلمانوں کو غیر مسلم اقوام نے شکست دی ہو۔ البتہ مسلمانوں کو کسی نے شکست دی تو وہ مسلمان ہی تھے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا متعصب سیاست داں جس کا نام ڈی پی دھر ہے دو سال تک سپین میں مقیم رہ کر اس بات پر ریسرچ کرتا رہا ہے کہ مسلمانوں کی سپین میں آٹھ سو سالہ

حکومت کے بعد آخر کونسی ایسی بات تھی کہ جس سے وہ وہاں بالکل ختم ہو گئے۔ تاکہ برِ صغیر میں بھی اسی پر عمل کیا جائے۔ اس مہم میں وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمانوں کو غیر مسلم شکست نہیں دے سکتے۔ مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے مسلمانوں کو استعمال کرنا چاہئے چنانچہ یہی ہے جو سبق ہندوؤں نے حاصل کیا اُسے مشرقی پاکستان میں آزمایا اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

لیکن دشمنانِ اسلام اب بھی راضی نہیں ہیں وہ بقیہ پاکستان کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں اور اس کام کے لئے وہ مسلمانوں کو استعمال کر رہے ہیں۔

لہٰذا مسلمانو! خدا کا خوف کرو آپس میں اختلاف بند کر دو۔ اور اپنی پوری قوت مجتمع کر کے دشمنانِ اسلام کے ناپاک عزائم کو ناکام بنانے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ہو جاؤ۔ ہمارے اختلافات معمولی ہیں لیکن دشمنانِ اسلام کے آپس کے اختلافات بہت بڑے ہیں۔ اگر آپ ایک ہو گئے تو دنیا کی کوئی طاقت آپ کو نہیں مٹا سکتی۔ اس کام کے لئے جہاں ظاہری اسباب کی ضرورت ہے وہاں روحانی قوت کی بھی ضرورت ہے لہٰذا روحانیتِ اسلام کو سمجھو اور اس پر عمل کر کے غلبۂ نفس کم کرو۔ اور غلبۂ روحانیت بڑھاؤ تاکہ دشمن پر غلبہ حاصل ہو سکے۔ کلمۂ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں وہ طاقت ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ وقت کلمۂ طیّبہ پر عمل کرنے کا ہے۔

جن کتابوں کا مطالعہ کیا گیا

کتاب	مصنف
۱۔ سرّ دلبراں	حضرت مولانا سید محمد ذوقی رح
۲۔ تذکرۃ الاولیاء	شیخ فرید الدین عطار رح
۳۔ فیوض الحرمین	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح
۴۔ انسانِ کامل	حضرت عبدالکریم جیلی رح
۵۔ حیات امام ابنِ تیمیہ رح	مولانا یوسف کوکن
۶۔ طب جسمانی و طب روحانی	امام غزالی رح
۷۔ تزکیۂ نفس	مولانا امین احسن اصلاحی
۸۔ مضامین ذوقی	حضرت مولانا سید محمد ذوقی شاہ
۹۔ سوانح امام احمد بن حنبل	
۱۰۔ شمائم امدادیہ	حاجی امداد اللہ مہاجر مکی
۱۱۔ امداد السلوک	مولانا رشید احمد گنگوہی رح
۱۲۔ تقریر دلپذیر	مولانا محمد قاسم نانوتوی رح
۱۳۔ تنبیہ الظرفی	مولانا اشرف علی تھانوی رح

1. INTRODUCTION TO HISTORY, OF SUFISM BY PRO: ARBERY.
2. ILEA OF PERSONALITY IN SUFISM BY R.A. NICHOLSON
3. ASPECTS OF ISLAM BY MACDO NALD

توحید متاعیست کہ بردار فروشند
گل نیست کہ در کوچہ و بازار فروشند

الفیصل
ناشران وتاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور